فاتبعونی یحببکم اللہ

مولانا احمد رضا خاں

(اور ان کے معاصر علماء اہلسنت)

کی علمی و ادبی خدمات

ڈاکٹر غلام یحییٰ مصباحی

ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا (رجسٹرڈ)، پاکستان

کراچی، اسلام آباد

جملہ حقوق عکس وطباعت حق ادارہ محفوظ ہیں

نام ——— مولانا احمد رضا (اور ان کے معاصر علماء اہلسنت) کی علمی وادبی خدمات
تحریر ——— ڈاکٹر غلام یحییٰ مصباحی
ابتدائیہ ——— پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد
سن اشاعت ——— ۱۴۲۰ھ / ۱۹۹۹ء
صفحات ——— ۱۹۲
تعداد ——— ایک ہزار
نگران اشاعت ——— اقبال احمد اختر القادری
ناشر ——— ادارہ تحقیقات امام احمد رضا پاکستان
ہدیہ ——— ۵۰ روپیہ

تقسیم کار

☆

المختار پبلی کیشنز، کراچی

۱۔ ۲۵۔ جاپان مینشن، رضا چوک (ریگل) صدر کراچی۔ ۷۴۴۰۰
فون : ۰۲۱۔۷۷۲۔۱۵۰
۲۔ ۴۴/۴۔ ڈی، گلی نمبر ۳۸، سیکٹر ایف ۱/۶، اسلام آباد۔ ۴۴۰۰۰
فون : ۰۵۱۔۸۲۵۵۸۷

فہرس

☆

ابتدائیہ ۔۔۔۔۔ ۴
۱۔ مولانا احمد رضا خاں رضا بریلوی ۔۔۔۔۔ ۷
۲۔ مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی ۔۔۔۔۔ ۳۸
۳۔ مولانا عبدالسمیع بیدل رام پوری ۔۔۔۔۔ ۴۶
۴۔ مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری ۔۔۔۔۔ ۵۵
۵۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش جالندھری ۔۔۔۔۔ ۷۷
۶۔ مولانا سید محمد محدث، سید کچھوچھوی ۔۔۔۔۔ ۸۲
۷۔ مولانا سید محمد نعیم، نعیم مراد آبادی ۔۔۔۔۔ ۹۸
۸۔ مولانا محمد امجد علی اعظمی ۔۔۔۔۔ ۱۲۵
۹۔ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری ۔۔۔۔۔ ۱۴۲
۱۰۔ مولانا محمد مصطفیٰ رضا خاں نوری بریلوی ۔۔۔۔۔ ۱۵۷

Printed by Al-MUKHTAR Publication Karachi Ph # 7725150

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

جناب ڈاکٹر غلام یحییٰ مصباحی نے ۱۹۹۱ء میں شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی (بھارت) میں بریلوی علماء کی ادبی و علمی خدمات، کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لئے رجسٹریشن کرایا۔ موصوف نے ڈاکٹر رفعت جمال صاحبہ کی نگرانی میں ۱۹۹۳ء میں اپنا مقالہ مکمل کیا اور ۱۹۹۴ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی۔۔۔ عنوان میں لفظ "بریلوی" سے بظاہر کسی فرقہ کا گمان ہوتا ہے حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ برصغیر میں عرف عام میں اس جماعت کو "بریلوی" کہا جاتا ہے جس کا تعلق سلف صالحین سے ہے اور جس کا مقبول و محبوب نام "اہل سنت و جماعت" ہے۔ دور جدید کے اجداد کا تعلق اسی جماعت سے تھا اور اس جماعت کو سواد اعظم کہا جاتا تھا اور کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے مقالہ کا عنوان بدل دیا اور یہ عنوان رکھا۔

علمائے اہل سنت کی علمی و ادبی خدمات

ڈاکٹر غلام یحییٰ مصباحی نے اشاعت کے لئے یہ مقالہ ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی کو ارسال فرمایا۔۔۔ پاکستان کے محققین و دانشوروں کو یہ مقالہ دکھایا گیا انھوں نے مزید اضافوں کی سفارش کی اور نظر ثانی کی تجویز پیش کی۔ ایک دو سال گزر گئے مگر ادارے کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ اس مقالے میں سات ابواب ہیں، تیسرا باب نسبتاً بہتر تھا اس لئے فاضل مقالہ نگار کے اصرار کے پیش نظر ان کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ باب

ادارۂ مسعودیہ، کراچی کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے جس کے لئے حاجی معراج الدین صاحب اور حاجی محمد الیاس صاحب شکریہ کے مستحق ہیں۔ انشاء اللہ نظر ثانی کے بعد پورا مقالہ ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی کی طرف سے شائع کر دیا جائے گا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ علماء و مشائخ کا ادب سے کوئی تعلق نہیں یا ہے تو بہت ہی کم، یہ خیال صحیح نہیں۔ راقم نے ان حضرات کے ہاں ایسے ایسے جواہر پارے دیکھے ہیں کہ اردو کے عناصر خمسہ بھی منہ تکتے رہ جائیں۔۔۔ ادب کا تعلق دل سے ہے اور اس کی بنیاد صداقت پر ہے کہ حسن صداقت ہے اور صداقت حسن ہے۔ ہم نے جھوٹ اور خیال آرائیوں کو ادب سمجھ لیا اور قرآن حکیم جو حسن و صداقت کی جان ہے اس کو ادب کے خانے سے نکال کر مذہب کے خانے میں ڈال دیا اور یہ نہ دیکھا کہ زبان و بیان اور حسن و جمال کا وہ ایسا بے مثال اور لازوال نمونہ ہے جس کو سن کر عرب زبان دانوں کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں، آج تک کوئی ادیب و شاعر ایسا ایک جملہ بھی پیش نہ کر سکا۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے چھوٹے بھائی حسن بریلوی، داغ دہلوی کے شاگرد تھے ایک روز انھوں نے استاد کو اپنے بھائی رضا بریلوی کا شعر سنایا تو وہ پھڑک گئے اور کہنے لگے۔۔۔۔

"مولوی ہو کر ایسے اچھے شعر کہتا ہے؟"

تعریف اپنی جگہ پر مگر اس جملے سے "مولوی" کا جو تصور ابھرتا ہے وہ بھی یہی ہے کہ مولوی وہ اچھے شعر نہیں کہہ سکتا۔۔۔ اتنے بڑے شاعر نے کیسی عجیب بات کہی! ۔۔۔۔

ہمارے اکثر ادیب و شاعر دین سے بے گانہ ہیں، ان کو یہ بھی پسند نہیں کہ ان

کے حلقے میں کوئی "مولوی" داخل ہو۔ اسی لئے آپ تاریخ ادب اردو کے مرتبین کو دیندار شعراء و ادباء کو نظر انداز کرتا ہوا پائیں گے جن کے دل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت سے معمور ہیں اور جن کو عرف عام میں "بریلوی" کہا جاتا ہے، ہماری کلیات و جامعات کے نصاب میں بالعموم ان کا ذکر و فکر تک نہیں۔ دنیائے علم و دانش میں یہ تنگ ظرفی اور بے خبری حیرت ناک ہے!

بہر حال پاکستان میں بھی ان حضرات پر کچھ کام ہوا ہے اور تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں۔۔۔ مگر یہ اعزاز بنارس ہندو یونیورسٹی کو حاصل ہوا کہ اس نے بریلوی علماء کی ادبی و علمی خدمات پر تحقیق کی اجازت دی شاید یہ عنوان پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں تحقیق کے لئے منظور نہ ہو سکتا۔۔۔ ہماری جامعات میں بریلوی شخصیات پر تحقیق میں محققین کو ناقابل بیان رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں خود کو مسلمان سمجھنے والوں کی یہ تنگ دلی ارباب علم و دانش کے لئے سخت حیرت ناک ہے۔۔۔ ہندوستان کی جامعات میں زیادہ کشادہ دلی معلوم ہوتی ہے وہاں زندہ شخصیات پر بھی تحقیق کی اجازت ہے جب کہ ہمارے ہاں مرنے کا انتظار کیا جاتا ہے، ایک طرف یہ شکایت کہ مسلمان مردہ پرست ہیں اور دوسری طرف یہ طرز عمل تعجب خیز ہے۔

بہر حال اس وقت آپ کے سامنے بنارس ہندو یونیورسٹی میں منظور ہونے والے مقالہ ڈاکٹریٹ کا تیسرا باب فاضل مقالہ نگار کی اجازت سے کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس سے مستفید ہوں گے اور فاضل مقالہ نگار کو دعاؤں سے نوازیں گے۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۷ء
کراچی (سندھ)

احقر محمد مسعود احمد صاحب
۹ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ

(۱)

مولانا احمد رضا خان بریلوی

احمد رضا خان نام اور رضا تخلص ہے۔ مولانا احمد رضا خان نسباً پٹھان مسلکاً حنفی شرباً قادری اور مولداً بریلوی تھے۔ ان کے والد ماجد مولانا نقی علی خان (م ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) اور جد امجد مولانا رضا علی خان (م ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۶ء) بلند پایہ عالم اور صاحب دل تھے، مولانا احمد رضا خان نے اپنے نعتیہ دیوان حدائق بخشش میں ان دونوں کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ ؎

احمد ہندی رضا ابن نقی ابن رضا

مولانا احمد رضا خان ۱۰ شوال ۱۲۷۲ھ / ۱۴ جون ۱۸۵۶ء کو بریلی میں پیدا ہوتے مولانا کا نام محمد رکھا گیا اور تاریخی نام المختار (۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء) لیکن جد امجد مولانا رضا علی خان نے احمد رضا تجویز کیا۔ بعد میں مولانا احمد رضا نے خود اس نام کے ساتھ "عبدالمصطفیٰ" کا اضافہ کیا۔ چنانچہ اپنے نعتیہ دیوان میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؏

خوف نہ رکھ رضا ذرا تو تو ہے عبد مصطفیٰ
تیرے لئے امان ہے تیرے لئے امان ہے

مولانا کے اسلاف عہد مغلیہ میں قندھار سے ہندوستان آئے تھے مغل شہنشاہوں کے دربار میں مناصب جلیلہ پر فائز رہے اور جاگیریں حاصل کیں لیکن ان کے دادا مولانا شاہ رضا علی خان کو جو اپنے وقت کے بے مثال عالم اور ولی تھے سرکاری عہدوں سے کوئی لگاؤ نہ رہا۔ یہی حال ان کے والد ماجد کا بھی رہا۔

مولانا احمد رضا خاں نے میزان و منشعب مولانا مرزا غلام قادر بیگ بریلوی سے پڑھی بعد میں مرزا صاحب نے ان سے ہدایہ کا سبق لیا، مولانا محمود احمد قادری نے لکھا ہے کہ تیرہ برس کی مختصر سی عمر میں ۱۲۸۲ھ میں والد ماجد سے درسیات کی تکمیل کی ۱۲۹۱ھ کے بعد تھوڑے دنوں رام پور میں قیام کر کے مولانا عبد العلی ریاضی داں سے شرح چغمنی کے چند سبق پڑھے" [۱]۔ انہوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ انہوں نے کتنے دنوں تک تعلیم حاصل کی مگر اصغر حسین خاں کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا احمد رضا خان نے رام پور میں ایک سال تک تعلیم پائی اور باقی تعلیم بریلی میں حاصل کی چنانچہ اصغر حسین خان لکھتے ہیں:۔

> "مولانا نے چار سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا مزید تعلیم مرزا غلام قادر بیگ، مولانا ابو الحسین نوری مارہروی، مولانا عبد العلی رام پوری اور والد محترم سے حاصل کی صرف چودہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے"۔ [۲]

لیکن دونوں تحریروں کے بر خلاف مشہور دانشور پروفیسر مسعود احمد تحریر فرماتے ہیں:۔

"فاضل بریلوی نے اپنی فطری ذکاوت کی بنا پر ۱۳ سال ۱۰ مہینے اور ۵ دن میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی ایک جگہ خود تحریر فرماتے ہیں:۔ وذالک لمنتصف شعبان ۱۲۸۶ھ الف و ماء تین و ست و ثمانین و انا اذ ذاک ابن ثلثتہ عشر عاما و عشرۃ اشھر و خمسۃ ایام و فی ھذا التاریخ فرضت علی الصلوۃ و تو جہت الی الاحکام"۔ (ترجمہ) وسط شعبان ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی اور اس وقت ۱۳ سال ۱۰ ماہ اور ۵ دن کا ایک نو عمر لڑکا تھا اور

اسی تاریخ کو مجھ پر نماز فرض ہوئی اور شرعی احکام میری طرف متوجہ ہوئے"۔ [۳]

ان بیانات کی روشنی میں مسعود صاحب کا خیال قرین قیاس ہے کیونکہ انہوں نے مولانا احمد رضا خان صاحب کی عبارت پیش کی ہے جس میں ۱۳ سال ۱۰ مہینے اور ۵ دن میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کرنے کی تاریخ درج ہے۔ مولانا کی عبارت پیش کر کے حوالہ کے طور پر ان کی ایک تصنیف الاجازۃ الرضویہ لمبجل مکۃ البہیہ (۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کا ذکر کیا ہے۔

بہر حال مولانا احمد رضا خان نے اپنی فطری ذکاوت کی بنا پر ۱۳ سال ۱۰ مہینے اور ۵ دن میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی علوم عربیہ سے فراغت کے بعد ہی ان کے والد ماجد مولانا نقی علی خاں نے افتاء کی ذمہ داریاں بھی ان کو سپرد کر دیں اور اس چھوٹی سی عمر میں فتوی نویسی کا آغاز کیا۔ بڑے ہوئے تو ایک ماہ کی قلیل مدت میں قرآن مجید حفظ کر ڈالا۔

مولانا احمد رضا خان صاحب نے علوم درسیہ کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی بھی تحصیل کی اور بعض علوم و فنون میں تو خود ان کی طبع سلیم نے رہنمائی کی ان علوم و فنون میں علم قرآن، علم حدیث، اصول حدیث، فقہ (جملہ مذاہب)، فلسفہ، تکسیر، ہیئت، حساب، ہندسہ، قرآت، تجوید، تصوف، سلوک، اخلاق، اسماء الرجال، سیر، تاریخ، لغت، ادب، ارثماطیقی، جبر و مقابلہ، حساب ستینی، لوگارثمات، توقیت، مناظر و مرایا، اکر، زیجات، مثلث کروی، مثلث سطح، ہیاۃ جدیدہ، مربعات، جفر، زائرجہ وغیرہ آتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے علم فرائض، نثر و نظم ہندی، خط نسخ اور خط نستعلیق وغیرہ میں بھی کمال حاصل کیا۔ اس طرح مولانا احمد رضا خان بریلوی نے جن علوم و فنون پر دسترس حاصل کی ان کی تعداد ۵۴ سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کہ انہوں نے ان علوم کی تحصیل کی بلکہ ہر ایک علم و فن میں اپنی کوئی نہ

کوئی یادگار چھوڑی مولانا بریلوی خود تحریر فرماتے ہیں:۔

"ولی فی کلہا او جلہا تحریرات و تعلیقات من زمن طلبی
الی ہذا الحین۔" ۱۳۲۳ھ / ۹۰۵ء۔ [۴]

مولانا احمد رضا خان ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء میں اپنے والد ماجد مولانا نقی علی خاں کے ہمراہ مولانا شاہ آل رسول (م ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء) سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے سید آل رسول نے انہیں اجازت و خلافت بھی دی۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے علم و فضل کو دیکھ کر ان کے ماننے والوں نے مجدد مآۃ حاضرہ سے نوازا۔ ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء میں عظیم آباد (پٹنہ) میں قاضی عبدالوحید (م ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) رئیس پٹنہ کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں بریلوی علماء کثیر تعداد میں حاضر تھے ان علماء میں مولانا احمد رضا صاحب بھی موجود تھے۔ جلسہ کی کاروائی "دربار حق و صداقت" کے نام سے چھپی اس میں فاضل بریلوی کا وعظ بھی چھپا۔ اس جلسہ میں مولانا عبدالمقتدر بدایونی نے فاضل بریلوی کو مشاہیر علماء کی موجودگی میں ان الفاظ سے یاد کیا:۔

جناب عالم اہل سنت مجدد مآۃ حاضرہ مولانا احمد رضا خاں" [۵]

دوسرے علماء نے اس کی تائید کی اور اس بات پر سب لوگ متفق ہوئے کہ مولانا احمد رضا خان چودہویں صدی کے مجدد ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں کو ان کے ماننے والوں نے اپنا امام بھی تسلیم کیا ہے جس سے ان کی عقیدت اور مولانا بریلوی کی عظمت کا احساس ہوتا ہے مولانا کے علم و فضل کا اعتراف بہت سے حضرات نے کیا ہے چنانچہ مولانا کوثر نیازی تلمیذ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:۔

"وہ (مولانا احمد رضا خاں) بیک وقت ایک عظیم ادیب بھی تھے اور خطیب بھی،

مناظر بھی تھے اور متکلم بھی، محدث بھی تھے اور مفسر بھی، فقیہ بھی تھے اور سیاست داں بھی اور جب وہ تحریث نعمت کے طور پر کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے (اور اس لفظ "سخن" میں کلام کی سبھی شاخیں شامل ہیں) کہ ؎

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں"٦

خورشید احمد رقمطراز ہیں:-

"Maulana Ahmed Raza Khan is the founder of Bareilvi School of thought and one of the most important scholars of this era---- He was master in ‘ Philosophy and mathematics".

میر خلیل الرحمن (ایڈیٹر انچیف روزنامہ جنگ کراچی) اس طرح قلمبند ہیں:-

"Relegious scholars, like Imam Ahmed Raza having full command over all faculties of knowledge (Science and Arts) are hardly born after many centuries, He lead his whole life in following the Sunnah and for the love of Muhammad Mustafa (Sallallaho alahi wasllam). His knowledge, religious and temporal, was unipersonal to his self. People, having thirst for knowledge, seek inspiration and instruction from the acadmic and thought provoking treasure he left.

Millions of people belong to his school of thought through out the world particularly in the ^ Indo-Pak sub continent".

مولانا احمد رضا کی شخصیت اور علمی فضیلت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان پر ہند اور بیرون ہند یونیورسٹیوں میں کئی حیثیتوں سے تحقیقی کام ہوئے اور ہو رہے ہیں اور بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ان یونیورسٹیوں میں جواہر نہرو لال یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، بنارس ہندو یونیورسٹی، کیلیفورنیا یونیورسٹی (امریکہ)، کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک)، لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ)، لندن یونیورسٹی (لندن)، محمد بن سعود یونیورسٹی، ریاض (سعودی عرب)، الازہر یونیورسٹی (مصر)، کراچی یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ (پاکستان) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

تصنیف و تالیف: مولانا احمد رضا خان نے اپنی پوری زندگی تصنیف و تالیف میں گزاری۔ اسلامیات کو اپنا موضوع بنا کر ملت کی خدمت کی ان کی بیشتر کتابیں عربی اور اردو میں ہیں۔ فارسی میں بھی لکھا اور اس طرح بیک وقت عربی، فارسی اور اردو کی خدمت انجام دی لیکن اردو دنیا میں ان کی تصانیف کو اہم مقام حاصل ہے۔ مولوی رحمٰن علی نے "تذکرۂ علمائے ہند" میں ان کی تصانیف کی تعداد ۷۵ تحریر کی ہے اس وقت مولانا موصوف کی عمر ۳۰ برس تھی لیکن عمر کے اضافے کے ساتھ ہی تصانیف کی تعداد بھی بڑھتی رہی۔ ۱۹۰۵ء میں خود مولانا نے اپنی تصانیف کی تعداد ۲۰۰ بتائی ہے۔ مولانا ظفر الدین بہاری نے ۱۹۰۹ء میں مختلف علوم و فنون پر ان کی ۳۵۰ تصانیف کا ذکر کیا ہے اس میں ۱۰۰ عربی، ۲۷ فارسی اور ۲۲۳، اردو کی تصانیف ہیں لیکن مولانا بریلوی کے صاحبزادے مولانا حامد رضا خاں نے ۴۰۰ سے زیادہ تعداد بتائی ہے۔

یہ تعداد و شمار مختلف اوقات میں مولانا فاضل بریلوی کی زندگی میں مرتب کیے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا ظفر الدین بہاری نے شمار کیا تو یہ تعداد چھ سو سے زیادہ نکلی جس کا تفصیلی ذکر انہوں نے "حیات اعلیٰ حضرت" جلد دوم میں کیا ہے۔ ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء میں بمبئی سے ماہنامہ "المیزان" کا امام احمد رضا نمبر شائع ہوا ہے اس میں مولانا بریلوی کی پچاس علوم و فنون پر ۵۴۸ تصانیف کا ذکر موجود ہے۔ ماہنامہ قاری، دہلی اپریل ۱۹۸۹ء نے بھی یہی تعداد ۵۴۸ شائع کی ہے۔ مفتی مجاز ولی خاں نے مزید تحقیق کی تو یہ تعداد ہزار سے بڑھ گئی۔ انہوں نے مولانا احمد رضا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

„صاحب التصانیف العالیہ و التالیفات الباہرہ التی بلغت اعداد ہا فوق الالف„۔[9]

میری تحقیق کے مطابق مجاز ولی خاں کی تحقیق حق بجانب ہے۔

قرآن و تفسیر:- مولانا رضا بریلوی کو مختلف علوم و فنون میں بڑی مہارت حاصل تھی جن کی شہادت ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔ علم قرآن میں ان کا ترجمہ اردو امتیازی شان کا مالک ہے۔ جو "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" کے نام سے ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔ پھر اس پر مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے "خزائن العرفان فی تفسیر القرآن" کے عنوان سے تفسیری حواشی لکھے۔

ترجمہ قرآن میں مولانا احمد رضا خان بریلوی نے جس عاقبت اندیشانہ احتیاط کو پیش نظر رکھا ہے وہ تراجم کے تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہے۔ مولانا بریلوی کے اس ترجمہ قرآن کے بارے میں استاد سعید بن عزیز یوسف زئی امیر جمعیت برادران اہل حدیث پاکستان تحریر فرماتے ہیں:-

"جہاں تک علمائے دیوبند کا تعلق ہے وہ تو نہایت شد و مد سے اس کی مخالفت کرتے ہیں بلکہ تکفیر کرتے ہیں مگر میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ کہوں گا کہ آلٓم سے لے کر والناس تک ہم نے کنز الایمان میں نہ تو کوئی تحریف پائی ہے اور نہ ہی ترجمہ میں کسی قسم کی غلط بیانی کو پایا ہے۔ نہ ہی کسی بدعت ور شرک کرنے کا جواز پایا ہے بلکہ یہ ایک ایسا ترجمہ قرآن مجید ہے کہ جس میں پہلی بار اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ جب ذات باری تعالیٰ کے لئے بیان کی جانے والی آیتوں کا ترجمہ کیا گیا ہے تو بوقت ترجمہ اس کی جلالت، علوت، تقدس و عظمت و کبریائی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ دیگر تراجم خواہ وہ اہل حدیث سمیت کسی بھی مکتب فکر کے علماء کے ہوں ان میں یہ بات نظر نہیں آتی ہے اسی طرح وہ آیتیں جن کا تعلق محبوب خدا، شفیع روز جزا، سید الاولین والآخرین، امام الانبیاء، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے یا جن میں آپ سے خطاب کیا ہے تو بوقت ترجمہ جناب مولانا احمد رضا خاں صاحب نے یہاں پر بھی اوروں کی طرح صرف لفظی اور نحوی ترجمہ سے کام نہیں چلایا ہے بلکہ صاحب ماینطق عن الھوی اور ور فعنالک ذکرک کے مقام عالی شان کو ہر جگہ ملحوظ خاطر رکھا ہے یہ ایک ایسی خوبی ہے جو کہ دیگر تراجم میں بالکل ناپید ہے"۔ ۱۰

مولانا احمد رضا کے ترجمہ کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں الفاظ و محاورہ کا حسین امتزاج ہے پھر انہوں نے ترجمہ کے سلسلہ میں بالخصوص یہ التزام بھی کیا ہے کہ ترجمہ لغت کے مطابق ہو اور الفاظ کے متعدد معانی میں سے ایسے معانی کا انتخاب کیا جائے جو آیات کے سیاق و سباق کے اعتبار سے موزوں ہوں اس ترجمہ سے قرآنی حقائق و معارف کے وہ اسرار و معارف منکشف ہوتے ہیں جو عام طور پر دیگر تراجم سے واضح نہیں ہوتے۔ یہ ترجمہ سلیس، شگفتہ اور رواں ہونے کے ساتھ روح

قرآن اور عربیت سے بہت قریب ہے۔ ان کے ترجمہ کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ احمد رضا بریلوی نے ہر مقام پر انبیاء علیہم السلام کے ادب و احترام اور عزت و عصمت کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے ترجمہ قرآن کے جملہ محاسن تحریر کرتے وقت الفاظ کا خزانہ کم پڑ جاتے گا۔ دوسرے تراجم کے مقابلے میں ان کی زبان کی خوبی کا اندازہ ان جملوں سے لگایا جا سکتا ہے:۔

آیت نمبر ۱۔ ذالک الکتاب لا ریب فیہ (پارہ ۱) مولانا محمود الحسن صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ "اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔" اور مولانا اشرف علی تھانوی اس کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں "یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں"۔ عربی محاورہ کے مطابق یہاں جنس ریب کی نفی ہے اور لفظ فی کا مدخول ظرفی ہوتا ہے کبھی زمان اور کبھی مکان تو اب معنی یہ ہو گا کہ قرآن مجید جنس ریب کا محل نہیں بنا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں کسی نے شک نہیں کیا حالانکہ دوسرے مقام پر ارشاد باری ہے:۔ "وان کنتم فی ریب مما نزلنا" اور اس سے واضح ہے کہ قرآن محل ریب بنا اور لوگوں نے اس میں ریب کیا ہے۔ یہی وہ اشکال تھے جسے رفع کرنے کے لئے علامہ تفتازانی نے "مطول" اور علامہ بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لمبی عبارتیں تحریر فرمائی ہیں لیکن مولانا احمد رضا خان نے ترجمہ کے چند الفاظ میں اشکال رفع کر دیا ہے مولانا بریلوی کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔ "وہ بلند مرتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں"۔ ذالک جو اشارہ بعید کے لئے آتا ہے (اشارۃ بعید) وہ کا معنی رکھتا ہے یہاں پر "ذالک الکتاب" کا ترجمہ "وہ بلند رتبہ کتاب" عبارت کا حسن بڑھا دیتا ہے۔ اور کتاب اللہ کی حقانیت اور اس کی عظمت کی طرف مشعر ہے۔

آیت نمبر ۲۔ یاایھا الناس اعبدو اربکم الذی خلقکم و الذین من قبلکم لعلکم تتقون (پارہ ۱۵ رکوع ۳) مولانا محمود الحسن صاحب ترجمہ کرتے ہیں:۔

"اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ"۔ مختلف ترجمہ نگاروں کے نزدیک لفظ لعل بمعنی لکی ہے یعنی تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ لیکن علامہ بیضاوی نے اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے ,,ولم یثبت فی اللغة مثلہ,, یعنی لغت میں اس کی مثال ثابت نہیں" پھر علامہ بیضاوی لکھتے ہیں کہ یہ حال ہے ضمیر اعبدوا سے۔ مطلب یہ ہوا کہ اعبدوا راجین ان بنحز طوافی سلک المتقین یعنی عبادت کرو یہ امید کرتے ہوئے کہ تم متقیوں کی صف میں شامل ہو جاؤ۔ مولانا احمد رضا خاں نے اسی استدلال کو اختیار کیا ہے اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا کام کیا ہے وہ آیت مذکور کا ترجمہ اس طرح تحریر کرتے ہیں "اے لوگو! اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے"۔

ادبی نقطہ نظر سے بھی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ترجمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے جتنے تراجم کی مثالیں پیش کی گئی ہیں ان میں احمد رضا خاں صاحب کا ترجمہ پرانا ہے اس وقت اردو زبان اتنی ترقی یافتہ نہ تھی جس شکل میں آج ہے مگر ان کی زبان اور طرز تحریر سے ایسا لگتا ہے کہ وہ آج ہی کا طرز تحریر ہے یہی ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مولانا احمد رضا خان صاحب کو قرآن سے غیر معمولی شغف تھا جس کے مطالعہ میں انہوں نے اپنی ساری عمر صرف کر دی اور اعلیٰ معیار کا ترجمہ اردو کو دیا جو ان کی برسوں کی فکر و تدبر کی دین ہے۔

مولانا احمد رضا خان نے ترجمہ قرآن کے علاوہ تفسیر کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا انہوں نے سورۃ ضحیٰ کی بعض آیتوں کی تفسیر ۸۰ جز تک لکھ کر چھوڑ دی۔ دینی و علمی مشاغل کی وجہ سے مزید قرآن کی مبسوط تفسیر نہ لکھ سکے اس کام کو ان کے

تلامذہ نے انجام دیا مثلاً تفسیر خزائن العرفان، تفسیر حسنات، تفسیر نعیمی، تفسیر ضیاء القرآن، تفسیر ازہری، تفسیر تنویر القرآن وغیرہ ان کے تلامذہ اور خلفاء نے لکھیں۔ حال کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے سورۃ فاتحہ سے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی چنانچہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرۃ کی شروع آیات کی تفسیر کچھ (مخطوطہ) اوراق دریافت ہوتے ہیں جس کو شائع کیا گیا ہے اس کے مرتب میں مولانا مفتی -(ادارۃ)

حدیث:- علم قرآن و علم تفسیر کے علاوہ علم حدیث میں بھی مولانا احمد رضا خاں صاحب کو تبحر حاصل تھا چنانچہ شیخ یسین احمد خیاری المدنی نے علم حدیث میں مولانا بریلوی کے تبحر کو یوں سراہا ہے "وھو امام المحدثین" یعنی اور وہ محدثین کے امام ہیں۔ [۱۱] ان کے فتاوے کے مطالعہ سے علم حدیث میں ان کی مہارت اور غیر معمولی آگہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس فن میں انہوں نے چند یادگار تصانیف بھی چھوڑی ہیں

فقہ و فتوی:- علم حدیث کے علاوہ علم فقہ میں مولانا احمد رضا خان بریلوی کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ان کی باریک بینی اور نظر غائر کی دلیل ہے جس کی مثال "فتاوی رضویہ" کی ۱۳ ضخیم جلدیں ہیں اس کی جلد اوّل میں انہوں نے اس پانی کی خصوصیات بیان کی ہیں جس سے وضو جائز ہے مولانا بریلوی نے اس پانی کی ایک سو ساٹھ قسمیں بیان کی ہیں اور وہ جس سے وضو ناجائز ہے اس کی ایک سو چھالیس قسمیں بیان کیں اسی طرح پانی کے استعمال سے عجز کی ۱۷۵ صورتیں بیان کیں ہیں اور اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا جس کا عنوان "سمح المذاء فیما یورث العجز عن الماء" ہے۔ "ماءِ مطلق اور ماءِ مقید کی تعریف میں ایک رسالہ لکھا جس کا عنوان یہ ہے "النور والنورق لاسفار الماء المطلق" وہ چیزیں جن سے تیمم جائز ہے ان کی ۱۸۱ قسمیں بیان کیں ۷۴ منصوصات اور ۱۰۷ مزیدات مصنف اور وہ چیزیں جن سے تیمم جائز

نہیں ان کی ۱۳۰ قسمیں بیان کیں ۵۸ منصوصات اور ۷۲ زیادات۔ ان کا مجموعہ فتاوی رضویہ بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی خوبیوں کا اعتراف مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

> "فقہ حنفی اور اس کی جزئیات پر ان کو جو عبور حاصل ہے اس
> کی نظیر شاید کہیں ملے اور اس دعوی پر ان کا مجموعہ فتاوی
> شاہد ہے"۔ ۱۲

فتاوی رضویہ کے مطالعہ سے مولانا احمد رضا خاں صاحب کے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم فقہ کتنا وسیع علم ہے اور ایک باکمال فقیہ ہونے کے لئے کس قدر علوم و فنون سے واقفیت ضروری ہے۔ مولانا بریلوی کے بعض فتاوے مختلف علوم و فنون پر مستقل رسائل معلوم ہوتے ہیں مثلاً حوض کی مقدار "دہ در دہ اور ذراع سے متعلق بحث پر ان کا یہ فتوی "الہنیئ النمیر فی الماء المستدیر" ریاضیات سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ معلوم ہوتا ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے دار الافتاء (بریلی) میں ہندو پاک، برما، چین، امریکہ، روس، افغانستان، افریقہ، اور اسلامی ملکوں وغیرہ سے بہت زیادہ فتاوے آتے تھے جن کی تعداد ایک وقت میں کبھی چار سو اور کبھی پانچ سو تک جا پہنچتی تھی۔ مولانا احمد رضا کے یہ فتاوے عربی، اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں ہیں، مطبوعہ "فتاوی رضویہ" میں تینوں زبانوں (عربی، اردو، فارسی) میں فتاوے موجود ہیں، انگریزی فتوے ان کے قلمی مجلدات میں ہیں جو بریلی میں محفوظ ہیں۔

۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنا پچاسی سالہ جشن تعلیمی منایا اس سلسلہ میں عباسیہ ہال میں تعلیمی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ جہاں بڑے بڑے طغروں میں ہندوستان کی ممتاز علمی شخصیتوں کے نام اور بعض تصانیف فن وار درج تھیں عقائد

و کلام کے طغرے میں مولانا احمد رضا خاں صاحب کی بھی کتابیں موجود تھیں اس موقع پر ایک مشہور شامی عالم شیخ عبدالفتاح ابو غدہ (پروفیسر کلیۃ الشریعہ) محمد بن سعود یونیورسٹی (ریاض) بھی حاضر تھے انہوں نے مولانا بریلوی کا مجموعہ فتاویٰ طلب کیا تھا۔ اس سے مولانا کے اس مجموعہ کی اہمیت اور شہرت کا پتا چلتا ہے۔ مشہور شاعر اور مفکر ڈاکٹر محمد اقبال "فتاویٰ رضویہ" کے بارے اپنا تاثر پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "ہندوستان کے دور آخر میں ان جیسا طباع اور ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ میں نے ان کے فتاوے کے مطالعہ سے یہ رائے قائم کی ہے اور ان کے فتاوے ان کی ذہانت، فطانت، جودت طبع، کمال فقاہت اور علوم دینیہ میں تبحر علمی کے شاہد عدل ہیں مولانا ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے ہیں اس پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ یقیناً اپنی رائے کا اظہار بہت غور و فکر کے بعد کرتے ہیں لہذا انہیں اپنے شرعی فیصلوں اور فتاوی میں کبھی کسی تبدیلی یا رجوع کی ضرورت نہیں پڑتی"۔ [۱۴]

ریاضی:- علوم منقولہ کے علاوہ علوم معقولہ میں بھی مولانا احمد رضا خان صاحب کو کمال حاصل تھا۔ ایک عالم دین کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس کا دائرہ فکر دوسرے علوم و فنون کو بھی اپنی گرفت میں اتنا ہی رکھتا ہے جتنا علم دین کو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ۱۹۱۱ء سے پہلے ڈاکٹر سر ضیاء الدین (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے علم مربعات سے متعلق ایک سوال اخبار دبدبہ سکندری (رام پور) میں شائع کرایا جس کا مولانا احمد رضا صاحب نے وقت پر جواب شائع کرا دیا اور اپنی طرف سے ایک اور سوال پیش کر دیا جس کو پڑھ کر سر ضیاء الدین صاحب کو تعجب ہوا کہ ایک

مولوی نے نہ صرف جواب دیا بلکہ الٹا سوال بھی پیش کر دیا۔ مولانا بریلوی سے سر ضیاء الدین کا یہ پہلا غائبانہ تعارف تھا۔ اس کے بعد وہ پروفیسر سید سلیمان اشرف بہاری کے کہنے پر ریاضی سے متعلق ایک حل نہ ہونے والا مسئلہ دریافت کرنے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے پاس گئے جس کو انہوں نے بخوبی حل کر دیا اس سے ریاضی میں مولانا کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

فلسفہ ہیأۃ و نجوم و سائنس:۔ علم ریاضی کے علاوہ علم ہیأۃ و نجوم میں بھی مولانا احمد رضا خاں صاحب کو کمال حاصل تھا۔ انگریزی اخبار ایکسپریس شمارہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں امریکی منجم پروفیسر البرٹ نے ۱۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کے بارے میں ایک دل دہلانے والی پیشن گوئی کی تھی۔ امریکی نجوم کی پیش گوئی کو رد کرتے ہوئے انہوں نے تین رسالے لکھے جو یہ ہیں (۱) الکلمۃ الملہمۃ فی الحکمۃ المحکمۃ لوھاء الفلسفۃ المشئمۃ (۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء) (۲) فوز مبین در رد حرکت زمین (۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء)(۳) نزول آیات فرقان بسکون زمین و آسمان (۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء)

صوتیات اور علم التوقیت میں بھی مولانا احمد رضا خان صاحب کو مہارت حاصل تھی اس فن سے متعلق مولانا کے یہ رسائل قابل ذکر ہیں (۱) البیان شافیا لفونوغرافیا (۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء)(۲) الجواھر والیواقیت فی علم التوقیت۔

علم تکسیر میں ایک رسالہ سید حسین مدنی کے لئے لکھا جس کا عنوان "اطائب الاکسیر فی علم التکسیر" ہے اور مولانا عبدالغفار بخاری کے لئے علم جفر میں رسالہ "سفر السفر عن الجفر بالجفر" لکھا۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی نہ صرف مذہبیات اور مختلف علوم و فنون تک محدود رہے بلکہ سماجی اور سیاسی شعور بھی رکھتے تھے انہوں نے معاشرے کی اصلاح کے

ساتھ سیاسی پہلو پر بھی غور و فکر کیا اس سلسلے میں مولانا کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں (۱) انفس الفکر فی قربان البقر (۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء) (۲) اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالسلام (۱۳۰۶ھ - ۱۸۸۸ء) (۳) تدبیر فلاح و نجات و اصلاح (۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء) (۴) دوام العیش فی الائمتہ من القریش (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) (۵) المحجتہ المؤتمنتہ فی آیتہ الممتحنہ (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) (۶) الطاری الداری ہفوات عبدالباری (۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء)

پہلے رسالہ میں گائے کی قربانی کے جواز و عدم جواز کے متعلق ایک استفتاء کا جواب ہے۔ رسالہ اعلام الاعلام میں دوسرے علماء سے اختلاف کرتے ہوئے ۱۸۸۸ء میں مولانا احمد رضا صاحب نے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیا اور سود کو حرام۔ دوام العیش میں مولانا نے مسئلہ خلافت پر بحث کی ہے۔

۱۹۲۰ء میں ہندوستان کے مشہور عالم مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بعض ایسے اقوال و اعمال سرزد ہوئے جو مولانا احمد رضا خان کی نظر میں خلاف شرع تھے اور سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے تباہ کن۔ چنانچہ انہوں نے اس طرزِ عمل پر سخت تنقید کی۔ مولانا کی یہ تنقیدات الطاری الداری لہفوات عبدالباری (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء) کے نام سے ان کے صاحبزادے مولانا محمد مصطفیٰ رضا خان نے تین حصوں میں بریلی سے شائع کر دیں۔

مولانا احمد رضا خان سیاسی استحکام کے لئے معاشی استحکام کو ضروری سمجھتے تھے دور جدید کے عالمی حالات سے ان کے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ ملت اسلامیہ کی معاشی و اقتصادی اور مذہبی و اخلاقی فلاح و بہبود کے لئے انہوں نے چند اہم تجاویز پیش کیں جو ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء میں کلکتہ اور رام پور سے شائع ہوئیں۔

مولانا احمد رضا نے ایک طرف اپنا رسالہ "تدبیر فلاح و نجات و اصلاح" لکھ کر

اپنی تجویزیں عام کیں تو دوسری طرف انصار الاسلام اور جماعت رضائے مصطفیٰ کے نام سے ان کے متبعین نے اصلاحی تنظیمیں قائم کیں۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات شروع ہوئی جو تحریک خلافت (۱۹۱۵ء) کا تتمہ کہی جا سکتی ہے۔ تحریک خلافت کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا جو ایک طوفان اٹھا تھا وہ اب شباب پر پہنچ گیا۔ مسلمان عوام و خواص اپنی سادگی اور سادہ لوحی کی وجہ سے اس کے مضر اثرات کو محسوس نہ کرتے تھے مگر مولانا احمد رضا خان صاحب نے یہ بات شدت سے محسوس کی اور مسلمانوں کو ایسے اتحاد سے باز رہنے کے لئے کہا جو ان کی سیاست و معیشت اور مذہب سب کو ختم کر کے رکھ دے۔ چنانچہ انہوں نے شدید علالت کے باوجود رسالہ المحجۃ المؤتمنۃ فی آیۃ الممتحنۃ (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) لکھا جس میں مسلمانوں کو اس اتحاد سے متنبہ کیا اور مخالفین کے عزائم سے خبردار۔

مولانا احمد رضا خان صاحب نے پہلا سفرِ حج اپنے والد ماجد مولانا نقی علی خان کے ساتھ [illegible] سال کی عمر میں ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں کیا۔ اسی سفر میں مناسک حج سے متعلق شیخ حسین بن صالح کے ایک وقیع رسالہ کی نہایت جامع و نافع شرح صرف دو دن کی مختصر مدت میں کی اور اس کا نام "النیرۃ الوضیئۃ فی شرح الجوہرۃ المضیئۃ" رکھا اس شرح کو علمائے حجاز نے بڑی مقبولیت کی نظر سے دیکھا۔ اس شرح میں پہلے مطلب پھر اختلاف مذاہب حنفیہ و شافعیہ اور مذہب حنفی میں اختیار راجح و ترک مرجوح کو مدلل و مبرہن کیا۔ پھر بعد میں اس رسالہ میں فوائد لطیفہ و توضیح مسائل و تخریج احادیث وغیرہ کے تعلیقات و حواشی لکھے جو ایک مستقل رسالے کی صورت میں "الطرۃ الرضیئۃ علی النیرۃ الوضیئۃ" کے نام سے شائع ہوا۔

اسی سفر میں علمائے ندوہ کے خلاف مشاہیر علمائے ملت اسلامیہ ہند کے حاصل شدہ فتاویٰ کا مجموعہ "الجام السنۃ لاھل الفتنۃ" کے ساتھ ۲۸ پیدا ہونے والے

سوالات اور ان پر اپنی جانب سے مدلل جوابات پر مشتمل ایک فتویٰ جب حاجیوں کے ذریعہ شیخ سید اسماعیل مکی بن شیخ خلیل محافظ کتب خانہ حرم شریف و تلمیذ رشید شیخ عبدالحق مہاجر مکی صاحب و دیگر علمائے مکہ کی خدمت میں پیش ہوا تو تمام علماء نے اپنی تصدیقات و تقریظات سے اس فتویٰ کا تیہ مقدم کیا اور ان حاصل شدہ توثیقات کا مجموعہ بنام "فتویٰ الحرمین برجف ندوۃ العلماء" ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔

مولانا احمد رضا خان صاحب نے دوسرا سفر حج ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں کیا حسام الحرمین (۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء)، الدولۃ المکیہ (۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۶ء) کفل الفقیہ الفاھم (۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء) وغیرہ اس سفر کی تصانیف ہیں۔ الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں علم غیب کا اثبات اور مخالفین علم غیب کی تردید کے ساتھ پوری وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ چار سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے مولانا سلامت اللہ رام پوری کی کتاب "اعلام لاذکیاء" کے آخر میں ایک عبارت سے متعلق تین سوالات اور ایک سوال خطبۂ مدارج النبوت للشیخ عبدالحق دہلوی سے متعلق ہے۔ مولانا کی مذکورہ بالا تصانیف اردو زبان میں ہیں۔

شعر و ادب: مولانا احمد رضا خان نہ صرف ایک عالم دین اور مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے بلکہ اپنے عہد کے ایک ممتاز و معروف شاعر بھی تھے ان کا تخلص رضا تھا وہ ایک باکمال و فطری شاعر تھے پروفیسر مسعود احمد کے بقول:-

> "مولانا بریلوی باکمال شاعر تھے، وہ تلمیذ رحمٰن تھے، شاعری میں ان کا کوئی استاد نہ تھا"۔ [۱۴]

اصناف شعر میں صنف نعت سے زیادہ مقدس، نازک اور دشوار گزار کوئی دوسری صنف نہیں اسی لئے فارسی شاعر عرفی کہتے ہیں "نعت لکھنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نعت میں ذرا بھی چوک ایمان کو خارج کر دیتی ہے رضا

بریلوی کے مطالعہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ اس مشکل اور نازک مرحلے سے گزرتے نظر آتے ہیں اور ذرا بھی کہیں لغزش نہیں ہوتی۔ رضا بریلوی کی نعت گوئی اپنے معیار کے اعتبار سے ایک انفرادی و امتیازی شان کی مالک نظر آتی ہے۔ وہ نعت کہتے وقت قرآن کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ قرآن سیرت مصطفیٰ کا آئینہ ہے اور اس آئینہ کو رو برو رکھنے کے بعد فکر کی رفتار میں کسی لغزش کا امکان ہی نہیں رہتا ہے۔ ان کا یہ مصرع ان کی نعتوں کا معیار پرکھنے کے لئے بہت کافی ہے ؎

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے آداب شریعت ملحوظ

مہکا ہے مرے بوئے دہن سے عالم
یاں نغمۂ شیریں نہیں تلخی سے بہم

کافی سلطان نعت گویاں ہیں رضا ان شاء اللہ میں وزیر اعظم (حدائق بخشش باقیات رضا حصہ سوم) مولانا احمد رضا مشہور نعت گو شاعر مولانا کفایت علی کافی شہید سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے احتیاط کے ساتھ نعت گوئی میں کمال حاصل کیا خود کہتے ہیں ؎

جو کہے کہ شعر و پاس شرع، دونوں کا حسن کیوں کر آتے
لا اسے پیش جلوۂ زمزمۂ رضا کہ یوں !!!

یہی کہتی ہے بلبل باغ جناں کہ رضا کی طرح کوئی سحر بیاں
نہیں ہند میں واصف شاہ ہدیٰ مجھے شوخی طبع رضا کی قسم

ابتداء میں رضا بریلوی کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا مثلاً ماہنامہ الرضا (بریلی) ماہنامہ تحفہ حنفیہ وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے نعت اور صرف نعت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اس صنف کو بہترین ادبی جواہر پاروں سے مزین کیا اور ایسی

ایسی نعتیں لکھیں جو زبان و بیان، فکر و فن، اظہار و ابلاغ اور تاثیر و تاثر کے اعتبار سے اردو ادب میں سرمایے کا درجہ رکھتی ہیں ان کی فارسی نعتیں بھی اسی درجہ کمال کی ہی ہوتی ہیں۔ انہوں نے نعت کے میدان میں اپنی جودت طبع کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں مولانا احمد رضا بریلوی کی ایک نعت ایسی بھی ہے جس میں اردو، ہندی اور عربی، فارسی الفاظ ایک ساتھ استعمال کئے ہیں جو نعت گوئی کا ذوق رکھنے والوں کے ذہنوں میں ہمیشہ اپنی جگہ قائم رکھے گی۔ یہ تخلیق ذہنی تنوع اور علمی ظرف کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کی مثال ہمیں ملتی۔ قاآنی، خسرو اور انشاء اللہ خاں انشا کے علاوہ شاید ہی کہیں نظر آسکے وہ نعت یہ ہے ؎

لم یات نظیرک فی نظر مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہ دوسرا جانا

البحر علا و الموج طغیٰ من بے کس و طوفاں ہوش ربا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا موری نیا پار لگا جانا

لیکن بیک وقت چار زبانوں میں کسی شاعر کی طبع آزمائی کی مثال نہیں ملتی ہے (ادارہ)

یا شمس نظرت الی لیلی چو بطیبہ رسی عرضے بکنی
توری جوت کی جھلجھل جگ میں رچی مری شب نے نہ دن ہونا جانا

لک بدر فی الوجہ الاجمل، خط ہالہ مہ زلف ابر اجل
تورے چندن چندر پروکنڈل رحمت کی بھرن برسا جانا

انا فی عطش و سخاک اتم، اے گیسوئے پاک اے ابر کرم
برسن ہارے رم جھم رم جھم دو بوند ادھر بھی گرا جانا

یا قافلتی زیدی اجلک، رحمے بر حسرت تشنہ لبک
مورا جیرا لرجے درک درک طیبہ سے ابھی نہ سنا جانا

واھاً لسویعات ذھبت آں عہد حضور بار گہت
جب یاد آوت موہے کر نہ پرت دردا وہ مدینہ کا جانا

القلب شج و الھم شجون، دل زار چناں جاں زیر چنوں
پت اپنی بپت میں کا سے کہوں مرا کون ہے تیرے سوا جانا

الروح فداک فزد حرقا یک شعلہ دگر برزن عشقا
مورا تن من دھن سب پھونک دیا یہ جان بھی پیارے جلا جانا

بس خامۂ خام نوائے رضا نہ یہ طرز میری نہ یہ رنگ مرا
ارشاد احبا ناطق تھا ناچار اس راہ پڑا جانا

رضا بریلوی کی ایک غزل محاسبۂ نفس کے لئے ہے اور ایسی مرصع ہے کہ جدید اردو شاعری بھی اس پر ناز کرے گی اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

سونا جنگل، رات اندھیری، چھائی بدلی کالی ہے
سونے والو! جاگتے رہیو، چوروں کی رکھوالی ہے

آنکھ سے کاجل صاف چرالیں یاں وہ چور بلا کے ہیں
تیری گٹھری تاکی ہے اور تونے نیند نکالی ہے

یہ جو تجھ کو بلاتا ہے یہ ٹھگ ہے مار ہی رکھے گا
ہائے مسافر دم میں نہ آنا مت کیسی متوالی ہے

مولانا احمد رضا خان رضا کا مجموعہ کلام مسمّی بہ "حدائق بخشش" دو حصوں پر مشتمل ہے اس کا مطبع چمن آفسیٹ پرنٹرس سوئیوالان، دہلی ہے اور سنۂ طباعت ۱۱ صفر ۱۴۰۳ھ ہے۔ اس کا حصہ اول ۹۷ صفحات اور حصہ دوم ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

رضا صاحب کے کلام کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری عشق رسول میں ڈوبی ہوئی اور شاعری کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ شاعر لکھنوی لکھتے ہیں:

> رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری جذبے کی پختگی کے علاوہ ایسی بے شمار فنی خوبیوں کی حامل ہے، جن کی مثال اس دور کے شعرا میں بہت کم ملتی ہے"۔ [۱۵]

شاعری میں ایک بہت ہی مشکل نوع علم ہیئت و نجوم و فلسفہ کی مصطلحات کا استعمال ہے جو اردو شاعری میں کم مستعمل ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان علوم کی اصطلاحات کو استعمال کرنے کے لیئے ان علوم کی سمجھ اور ان پر دسترس بہت ضروری ہے شاعری کی اس نوع پر رضا بریلوی سے قبل ملا بدر الدین نے البتہ علم ہیئت و نجوم کی اصطلاحات اپنے کلام میں پیش کیں اور اس فن کا اظہار مسلمان بادشاہ فیروز شاہ تغلق کی شان میں ایک طویل قصیدہ میں کیا لیکن نعت شریف میں ان مصطلحات کا استعمال کہیں نہیں نظر آتا اس لئے کہ یہ نوع شاعری کا سب سے محنت طلب امر ہے مگر رضا بریلوی میں خداداد صلاحیت کے مظاہر دیکھئے کہ ان مشکل ترین

مصطلحات میں بھی انہوں نے طویل نعتیہ قصیدہ لکھا جو ۵۵ یا ۸۵ اشعار پر مشتمل ہے اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں

علامہ شمس الحسن شمس بریلوی مرحوم مغفور نے ۱۲۵ اشعار کی شرح لکھی ہے "جو معارف رضا" کے ۱۹ اور ۱۹ کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ (ادارہ) ؎

خالق افلاک نے [illegible] طرفہ کہلائے چمن
ایک گل سوسن ہیں ہیں لاکھوں گل یاسمن
نقطہ پہ خط [illegible] خط [illegible] کہے خط غلط
تن کہے میں ہوں فقط جاں کہے مٹی ہے تن
سبزہ و گل دل نشین محو تماشائے حسین
بانٹے اقلیم حسین [illegible] بانٹ وطن
چشمہ بے آب میں عرض سرمو نہیں
ڈوبنے جائے کہاں شرم کے مارے کون

سفر حج کے دوران مکہ سے مدینہ روانگی کے وقت رضا صاحب نے ایک نظم تحریر فرمائی تھی جو واردات و کیفیات قلبیہ کی آئینہ دار ہے اور جس کے حرف حرف سے عشق محبت کے چشمے پھوٹ رہے ہیں اس نظم کا مطلع یہ ہے ؎

حاجیو ! آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو
رکن شامی سے مٹی وحشت شام غربت
اب مدینہ کو چلو صبح دل آرا دیکھو

رضا بریلوی نے جس کی تعریف کی اسی ایک نسبت سے کی۔ اولیا۔ کاملین کی منقبتیں لکھیں مگر اہل دول کی مدح و ثنا سے اپنے عشق و محبت کو رسوا نہ کیا اس سلسلے

میں وہ دیگر شعراء کی طرح درباری شاعر نہ تھے جو شعراء نوابوں دولت مندوں کی شان میں قصیدے کہہ کر پیسے لیتے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؂

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرادین پارۂ ناں نہیں

رضا کے برادر اصغر حسن رضا خان حسن نے اپنے استاد داغ دہلوی کو رضا صاحب کا یہ شعر ؂

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

سنایا تو داغ صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا کہ مولوی ہو کر ایسا شعر کہتا ہے۔ مولانا احمد رضا خان نے بلاغت کلام کے علاوہ نئی زمینوں میں اشعار لکھے طبیعت کی موزونی اور روانی نے کلام کو شعریت و تاثیر بخشی مثلاً ؂

رنگ مژہ سے کر کے خجل یار شاہ میں
کھینچا ہے ہم نے کانٹوں پہ عطرِ جمالِ گل

سرتا بقدم ہے تن سلطانِ زمن پھول
لب پھول دہن پھول ذقن پھول بدن پھول

طوبیٰ میں جو سب سے اونچی نازک سیدھی نکلی شاخ
مانگوں نعت نبی لکھنے کو روح قدس سے ایسی شاخ

پہلے شعر میں مژہ پر ابھرتے ہوئے اشکوں کو عطرِ جمالِ گُل رعنا کہنا اور مژہ کو کانٹے سے نسبت دینا بڑی نازک بات ہے۔ دوسرے شعر میں قامتِ محبوب خدا کی اس سے بہتر اور کیا تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ تشبیہ کی ندرت و پاکیزگی، فکر کی معانی.

آفرینی، الفاظ کا انتخاب، اظہار کی معصومیت، سب کے سب وصف ایک مطلع میں جمع ہو گئے ہیں۔ تیسرے شعر میں روح القدس سے طوبیٰ کی سب سے اونچی، نازک اور سیدھی شاخ مانگنے اور اس کا قلم بنا کر نعت نبی لکھنے کی تمنا ان کی نازک خیالی، تنوع اور ندرت فکر کا پتہ دیتی ہے اسی سلسلے کا ایک اور شعر توجہ کا طالب ہے ملاحظہ ہو ؎

ظاہر و باطن، اول و آخر، زیب فروع و زین اصول
باغ رسالت میں ہے تو ہی گل، غنچہ، جڑ، پتی، شاخ

یہاں فروع، اصول، اول و آخر اور ظاہر و باطن کہہ کر اس سے پھول، غنچہ، جڑ، پتی اور شاخ کا ثبوت فراہم کرنا، بدائع و اختراع سخن کا بڑا جامع نمونہ ہے۔ رضا بریلوی کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو جس میں کتنی سادہ بات کیسے خوبصورت انداز میں کہہ دی ہے ؎

قافلے نے سوئے طیبہ کمر آرائی کی
مشکل آسان الٰہی مری تنہائی کی

قافلے کا دیار حبیب کی طرف چلنے کے لئے کمر کسنا اور ایک عاشق رسول کا ایسے موقع پر تنہا رہ جانا کیا قیامت کا منظر ہے۔ ساتھ جانا اسی وقت ممکن ہے جب تنہائی کی مشکل آسان ہو۔ دیکھئے اس مشکل کی آسانی کے لئے وہ کیسی تڑپ کے ساتھ التجا کرتے ہیں ؎ "مشکل آسان الٰہی مری تنہائی کی"۔ اس التجا میں کتنی دردمندی آرزو اور حسرت کار فرما ہے۔ اس خوبصورت لہجے میں شاعرانہ حسن کے ساتھ انہوں نے اپنی دلی تمنا کا اظہار کیا ہے کہ جس کا ایک خاص اثر مرتب ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ان کی نعتیں سادہ، سہل اور عام فہم ہیں سوز و گداز ان کی شان امتیاز ہے۔ عاشقانہ جذبات سے بھرپور، فنی نقطۂ نظر سے بھی مشکل زمینوں کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے مگر عوام میں رضا بریلوی کی آسان اور سلیس نعتیں مقبول ہوئیں اور وہ آج بھی بریلوی مسلک کے لوگوں

میں وردِ زبان ہے جیسے رضا صاحب کا مندرجہ ذیل نعتیہ سلام ؎

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

اس سلام کے بارے میں مولانا کوثر نیازی تحریر فرماتے ہیں:-

> "اردو، عربی، فارسی تینوں زبانوں کا نعتیہ کلام میں نے دیکھا ہے اور بالاستیعاب دیکھا ہے۔ میں بلا توقف تردید کہتا ہوں کہ تمام زبانوں اور تمام زمانوں کا پورا نعتیہ کلام ایک طرف اور شاہ احمد رضا کا سلام "مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" ایک طرف۔ دونوں کو ایک ترازو میں رکھا جائے تو احمد رضا کے سلام کا پلڑا پھر بھی جھکا رہے گا میں اگر یہ کہوں کہ یہ سلام اردو زبان کا قصیدہ بردہ ہے تو اس میں ذرا بھر بھی مبالغہ نہ ہو گا۔ جو زبان و بیان، جو سوز و گداز، جو معارف و حقائقِ قرآن و حدیث اور سیرت کے جو اسرار و رموز، انداز و اسلوب میں جو قدرت و ندرت اس سلام میں ہے وہ کسی زبان کی شاعری کے کسی شہ پارے میں نہیں"۔[16]

رضا بریلوی صاحب اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ورد اس انداز میں کرتے ہیں ؎

محمد مظہر کامل ہے حق کی شان عزت کا
نظر آتا ہے اس کثرت میں کچھ انداز وحدت کا

وہ نامی کہ نام خدا نام تیرا
رؤوف و رحیم و علیم و علی ہے

دم نزع جاری ہو میری زباں پر
محمد، محمد، خدائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

انہوں نے ایک شعر میں اثرات حسن یوسفی اور عشق مصطفوی کا تقابل عجیب انداز میں کیا ہے ؎

حسن یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشت زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردان عرب

رضا صاحب نے صوفیانہ شعر بھی کہے ہیں۔ ان کی صوفیانہ شاعری کے مندرجہ ذیل چند اشعار اپنی لطافت و صداقت کے اعتبار سے کتنے بالیدہ ہیں اور تصوف کے کیسے مسائل ان اشعار کی توضیح کے پس پردہ ہیں وہ اشعار یہ ہیں ؎

آہ وہ آنکھ کہ ناکام تمنا ہی رہی
ہائے وہ دل جو ترے در سے پر ارمان گیا

یاد میں جس کی نہیں ہوش تن و جاں ہم کو
پھر دکھا دے وہ رخ اے مہر فروزاں ہم کو

جس تبسم نے گلستاں پہ گرائی بجلی
پھر دکھا دے وہ ادائے گل خنداں ہم کو

تنگ آتے ہیں دو عالم تیری بیتابی سے
چین لینے دے تپ سینۂ سوزاں ہم کو

نیر حشر نے اک آگ لگا رکھی ہے
تیز ہے دھوپ ملے سایۂ داماں ہم کو
چاک داماں میں نہ تھک جائیو اے دستِ جنوں
پرزے کرنا ہے ابھی جیب و گریباں ہم کو
پردہ اس چہرۂ انور سے اٹھا کر اک بار
اپنا آئینہ بنا اے مہِ تاباں ہم کو
اے رضا وصف رخ پاک سنانے کے لئے
نذر دیتے ہیں چمن مرغ غزل خواں ہم کو

اسی لئے رضا صاحب کی صوفیانہ شاعری سے متاثر ہو ڈاکٹر محمد طیب ابدالی تحریر فرماتے ہیں:-

> "حضرت امام احمد رضا خاں صاحب کا کمال فن ہے کہ تصوف کے مسائل دقیقہ کی توضیح کے بجائے عشق رسول کی سرمستی میں اپنے کو گم کرتے ہیں اور جب عشق رسول میں سرشاری ہوئی تو عرفان الٰہی کی آگہی ہوئی اور یہی نعت گوئی نہ صرف طریقت و حقیقت کی سرحد چھو لیتی ہے بلکہ اس میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کرتی ہے"۔ ۱۷

قصیدہ معراجیہ:- مولانا احمد رضا خاں رضا بریلوی نے ۷۶ اشعار پر مشتمل معراج نامہ لکھا ہے جو قصیدے کے انداز میں ہے اس کی تکنیک ماقبل کے سارے معراج ناموں سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں معراج کی روایات کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ شب معراج کا تہنیت نامہ ہے جس میں بہجت آگیں افکار کی نغمگی کا بہاؤ پورے قصیدے کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوتے ہے۔

اس کی زبان نہایت سادہ، شائستہ اور بامحاورہ ہے۔ روز مرہ کا برمحل اور مناسب استعمال قریب قریب ہر شعر میں نظر آتا ہے۔ زبان کی سلاست یہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے کہ آیت کریمہ یا احادیث کی تلمیحات تک سے امکانی طور پر کلام کو بچانے کی کوشش کی گئی ہے جب کہ معراج کے ذکر میں ایسا کرنا بہت دشوار ہے۔ ایسا نہیں کہ مولانا رضا خاں نے ان مقامات کو چھوا نہیں۔ جہاں تلمیح کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بلکہ ان مقامات کو ایسے سلیس انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جہاں اس کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی ہے اور مطلب واضح ہو جاتا ہے مثلاً قاب قوسین کی ترجمانی دیکھئے ؎

محیط و مرکز میں فرق مشکل رہے نہ فاصل خطوط واصل
کمانیں حیرت میں سر جھکائے عجیب چکر میں دائرے تھے

عربی و فارسی کے ایسے الفاظ جو صوتی اعتبار سے سماعت پر گراں گزرتے ہیں بہت کم استعمال ہوئے ہیں بیشتر خالص اردو کے مترنم الفاظ مصرعوں میں نگینے کی طرح جڑے ہوتے ہیں مثلاً ؎

خبر یہ تحویل مہر کی تھی کہ رت سہانی گھڑی پھرے گی
وہاں کی پوشاک زیب تن کی یہاں کا جوڑا بڑھا چکے تھے

اٹھی جو گرد رہ منور وہ نور برسا کہ راستے بھر
گھرے تھے بادل بھرے تھے جل تھل امنڈ کے جنگل ابل چلے تھے

اپنے معراج نامہ میں رضا صاحب نے عروس فن کے لب و رخسار کو خالص اردو الفاظ اور بندشوں کے سامان آرائش سے سجایا ہے بہ الفاظ دیگر اس میں فن کے وہ تمام محاسن موجود ہیں جو ایک اچھے فن پارے میں ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ بندشیں چست اور برمحل شیریں الفاظ کا در و بست، تشبیہات کی سادگی اور نکھار، استعارات کی

ودت، لہجے میں گھلاوٹ اور وارفتگی، طرز ادا میں نفاست، جذبات میں خلوص اور بے
ساختگی، فکر میں رعنائی اور رفعت، خیال کی شادابی اور طہارت ان ہی عناصر کے
متزاج سے ان کے تہنیت نامہ کے چہرہ کا غازہ تیار ہوا ہے انداز بیان کا نکھار
لاحظہ ہو ؎

یہ جوشش نور کا اثر تھا کہ آب گوہر کمر کمر تھا
صفائے رہ میں پھسل پھسل کر ستارے قدموں پہ لوٹتے تھے

وہ ظل رحمت وہ رخ کے جلوے کہ تارے چھپتے نہ کھلنے پاتے
سنہری زر بفت اودی اطلس یہ تھان سب دھوپ چھاؤں کے تھے

اس تہنیت نامہ میں سرور و نشاط کی کیفیت نے ایک متحرک بہاریہ فضا پیدا کردی ہے جس کی عکاسی رضا بریلوی نے نہایت وارفتہ اور پر کیف انداز میں کی ہے ان کے لہجے کی گھلاوٹ، کیف و مستی کے تصوراتی منظر کو ہماری آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیتی ہے اور ہم اس کی سرمستیوں کے بہاؤ میں بہنے لگتے ہیں چند شعر بطور مثال ملاحظہ ہوں ؎

وہاں فلک پر یہاں زمیں میں رچی تھی شادی مچی تھی دھومیں
ادھر سے انوار ہنستے آتے ادھر سے نفحات اٹھ رہے تھے

پھوٹ پڑتی تھی، ان کے رخ کی کہ عرش تک چاندنی تھی چھٹکی
وہ رات کیا جگمگا رہی تھی جگہ جگہ نصب آئنے تھے

نئی دلہن کی پھبن میں کعبہ نکھر کے سنورا سنور کے نکھرا
حجر کے صدقے کمر کے اک تل میں رنگ لاکھوں بناؤ کے تھے

شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے شعر میں موسیقی کا دار مدار بحر کے انتخاب پر منحصر ہے۔ رضا بریلوی کے مزاج کی نغمگی ملاحظہ کیجیے اپنے تہنیت نامہ کے لئے جن بحر کا انتخاب کیا ہے وہ ذاتی طور پر مترنم بحر ہے اس تہنیت نامے میں کوئی شعر ایسا نہیں جس میں موسیقی کا زیر و بم موجود نہ ہو اس کے سانچے میں جو ہلکے پھلکے خالص اردو الفاظ جوڑے گئے ہیں ایک سیال نغمے میں ڈھل گئے ہیں مثال ملاحظہ ہو:

حجاب اٹھنے میں لاکھوں پردے ہر ایک پردے میں لاکھوں جلوے
عجب گھڑی تھی کہ وصل و فرقت جنم کے بچھڑے گلے ملے تھے

براق کے نقش سم کے صدقے وہ گل کھلائے کہ سارے رستے
مہکتے گلبن لہکتے گلشن ہرے بھرے لہلہا رہے تھے

زبانیں سوکھی دکھا کے موجیں تڑپ رہی تھیں کہ پانی پائیں
بھنور کو یہ ضعف تشنگی تھا کہ حلقے آنکھوں میں پڑ گئے تھے

اردو کے ایک مشہور نعت گو شاعر محسن کاکوروی نے جب اس قصیدہ معراجیہ کو سنا تو حیرت زدہ ہو گئے اور اپنا قصیدہ "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" لپیٹ لیا اور جیب میں ڈال لیا، یہ اپنا قصیدہ رضا بریلوی ہی کو سنانے جا رہے تھے۔ اس قصیدہ معراجیہ کی فنی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر الٰہی بخش اختر اعوان تحریر فرماتے ہیں۔

> "محسن کاکوروی کے بعد جناب رضا بریلوی تک کوئی نعتیہ قصیدہ کہنے والا شاعر نہیں آتا جو محسن کے برابر تو کیا ان کے قریب بھی پہنچا ہو۔ جناب رضا کے ہاں پہلی بار قصیدے کے وہ سج دھج اور بلند آہنگی نظر آتی ہے جو فارسی کے عظیم المرتبت قصیدہ گو کا طرۃ

> امتیاز رہی ہے۔ ان کے قصیدۂ معراجیہ کو پڑھتے یوں لگتا ہے کہ الفاظ و معانی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے تخیل کی بلندی، فکر کی پختگی، جذبے کی شدت، الفاظ کی جزالت، بیان کی شان، انداز کی شوکت، تراکیب کا حسن، بندش کی چستی، تشبیہات و استعارات کی ندرت، معانی آفرینی، نکتہ سنجی، جذبے کی صداقت اور سب سے بڑھ کر عشق رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی چمک دمک اور خلوص کی مہک ان سب عناصر نے مل کر ان کے قصیدے کو ایک ایسا فن پارہ بنادیا ہے جس کی مثال نعتیہ قصیدہ گوئی میں بمشکل ہی دستیاب ہوگی"۔ ۱۸

محسن کاکوروی کے بعد اردو ادب میں رضا بریلوی نعتیہ قصیدہ لکھنے والے اہم
شاعر ہیں۔ ان کے ہاں پہلی مرتبہ قصیدے کی وہ سج دھج اور بلند آہنگی نظر آتی ہے جو
ارسی قصیدہ گو شعراء کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی رہی ان کی یہ خوبی ان کو اہم شعراء کی
صف میں جگہ دلواتی ہے ان کو میر درد، غالب، مومن، حسرت اور محسن کے بعد اردو
دب کی دنیا میں سب سے اہم مقام حاصل ہے۔ رضا بریلوی کے قصیدۂ معراجیہ کی
صوصیات پر مرزا نظام الدین بیگ مرحوم نے ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا تھا، جو
یک کتابچہ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ معارف رضا ۱۹۸۵ء میں یہ
قالہ چھپ چکا ہے (ادارۃ)

علم و ادب کا متوالہ، مذہبی رہنما، مختلف علوم و فنون کا ماہر اپنی تصانیف کا
یک گراں مایہ خزانہ چھوڑ کر ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء جمعہ کے دن دوپہر دو بج
ر ۳۸ منٹ پر بریلی میں اپنے محبوب حقیقی سے جاملا۔

(۲)

مولانا حسن رضا خان حسن بریلوی

حسن رضا خاں نام اور حسن تخلص تھا ان کے والد محترم مولانا نقی علی خاں ایک
بڑے عالم دین تھے۔[۱۹] ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۹۔ کو بر
میں پیدا ہوئے۔ مولانا حسن رضا نے اپنے والد کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پائی۔ ان
بڑے بھائی مولانا احمد رضا خاں بریلوی ہیں۔ خاندانی روایات کے مطابق مروجہ علو
اپنے خاندانی بزرگوں سے ہی حاصل کیے اور معقولات و منقولات میں مہارت حا
کرنے کے بعد درس و تدریس کا کام شروع کیا خاص طور سے دینی علوم کی
دیتے تھے۔

تصنیف و تالیف:- مولانا حسن ایک ممتاز مصنف و شاعر ہیں ان کی تصا
میں ان کی غزلوں اور نعتوں کا دیوان ہے جس کو لطیف حسین ادیب نے دیوان عا
لکھا ہے اس کے علاوہ چند دوسری تصانیف و رسائل بھی شامل ہیں جس پر مذ
رنگ زیادہ ہے۔ وہ بہار بے خزاں اور ایک ہفتہ وار اخبار روز افزوں کے نگراں
تھے جس سے ان کے ادبی ذوق اور مذہبی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے ان کی
تصانیف دستیاب ہیں جن میں سے چھ ان کی زندگی میں شائع ہوئیں۔ ان کا دیوان
طبع تھا کہ سفر حج پیش آیا اور وہاں سے واپسی پر ۱۳۲۶ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔
کی آٹھ مطبوعہ تصانیف یہ ہیں۔ (۱) تزک مرتضوی در اثبات تفضیل شیخین (
نگارستان لطافت در ذکر میلاد شریف (۳) بے موقع فریاد کا جواب در اثبات
قربانی (۴) آئینہ قیامت ذکر کربلائے معلّٰی (۵) دین حسن، در حقانیت اسلام، مطب

کان پور مارچ ۱۹۰۸ء۔ (۶) وسائل بخشش غوث الاعظم کی کرامات کے ذکر میں۔ (۷) ذوق نعت (مجموعہ نعتیہ کلام) (۸) ثمر فصاحت (مجموعہ کلام)

شعر و ادب:- مولانا حسن رضا خان بریلوی نثر نگار ہونے کے ساتھ ہی شاعر بھی تھے ان کے دور میں ہندوستان میں داغ کی شہرت تھی وہ رام پور میں قیام فرما تھے حسن رام پور گئے وہاں اپنے چچا جناب فضل حسن خان کے یہاں مقیم ہوئے اور داغ کے شاگرد ہو گئے۔ مولانا حسرت موہانی تحریر فرماتے ہیں:-

> "شعر و سخن کا شوق حضرت حسن کو ابتدا ہی سے تھا کچھ روز تک خود مشق کرتے رہے اس کے بعد داغ کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا اور ایک مدت تک رام پور میں رہ کر استاد کے گلشن سخن سے گلچینی فرماتے رہے یہاں تک کہ بجائے خود استاد مستند قرار پائے"۔ [۲۰]

داغ کی شاگردی میں ان کی شاعری پر بڑا نکھار آیا اور اس وقت کے عام رجحان شاعری سے ہٹ کر انہوں نے نعت گوئی پر توجہ مرکوز کر دی۔ ابتدا میں ان کا رجحان ہی غزل گوئی کی طرف تھا۔

حسن بریلوی نے شاعری کی ابتدا کی تو بریلی کی فضا میں استاد داغ کا رنگ حاوی تھا اور لوگ اسی انداز کی شاعری کر رہے تھے خاص طور سے ان کے شاگردوں نے ان کے رنگ کو بڑی ہوا دی جس میں حسن صاحب ان کے بہت چہیتے تھے۔ حسن کو بھی اپنے استاد سے بڑی عقیدت تھی جس کا اظہار انہوں نے داغ کی موت پر مرثیہ لکھ کر کیا اور ان کی مہربانی اور شفقت کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

پیارا شاگرد تھا لقب اپنا
کس سے اس پیار کا مزا کہئے

حضرت رضا اپنے چھوٹے بھائی حضرت حسن بریلوی کے دیوان "ذوق نعت" (۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء) سے متعلق ایک قطعۂ تاریخ میں کہتے ہیں ؎

شرع ز شعرش عیاں، عرش بہ بیش نہاں

حسن غزل گوئی کے فن سے خوب واقف ہیں ان کو اس میں اہم مقام حاصل ہے ان کی غزلیہ شاعری پرکشش، دلربا اور صنف سخن کی تمام خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے ان کو اپنے وقت کا ممتاز غزل گو شاعر کہنا بے جا نہ ہوگا۔ حسن نے داغ دہلوی کی غزل کی سوقیت دور کی زود گوئی کے باوجود غزل کی فضا کو برقرار رکھا۔ اظہار حدیث، خلوت، خمریات، شوخی اور دیگر مضامین غزل کو باندھنے میں باوصف استاد کی تقلید میں اپنی شاعری کو ایک تنگ دائرے میں محدود نہیں کیا بلکہ غزل کی فضا کو برقرار رکھتے ہوئے دلی جذبات کی فطری کسک کو پیش کیا ہے بطور مثال چند شعر یہ ہیں ؎

حسن جب مقتل کی جانب تیغ براں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا
آرزوے دید جاناں بزم میں لائی مجھے
بزم سے میں آرزوے دید جاناں لے چلا
جلوہ گہ میں سیل گریہ نے رکھا محروم دید
تشنہ لب سوکھے ہی گھاٹوں جوش طوفاں لے چلا
ڈھونڈھتی تھی ہر طرف کس کو نگاہ واپسیں
آس کس کے دید کی بیمار ہجراں لے چلا
اف ری متوالی جوانی کچھ خبر تجھ کو نہیں
ساغرے بوستہ لبہاے جاناں لے چلا

مہنگا سستا بیچ ڈالا مال اٹھتے بیٹھتے
اک جھلک میں وہ دم آخر دل و جاں لے چلا
کی ہیں کس کمبخت دل کے جذب نے گستاخیاں
کون بے پردہ انہیں سوئے شبستاں لے چلا
میرے گھر تک پاؤں پڑ کر ان کو لایا تھا نیاز
ناز دامن کھینچتا سوئے رقیباں لے چلا
دل کو جاناں سے حسن سمجھا بجھا کر لائے تھے
دل ہمیں سمجھا بجھا کر سوئے جاناں لے چلا

کس نے سنایا اور سنایا تو کیا سنا
سنتا ہوں آج تم نے مرا ماجرا سنا
قاصد ترے سکوت سے دل بیقرار ہے
کیا اس جفا شعار نے تجھ سے سنا کیا
آخر حسن وہ روٹھ گئے اٹھ کے چل دیئے
کمبخت اور حال دل مبتلا سنا
دم مردن تیرے قدموں پہ اگر سر ہوتا
حشر میں تاج کرامت مرے سر پر ہوتا
کیا کہوں طول شب ہجر ستمگر تجھ سے
کچھ جو ہوتا تو تری زلف سے بڑھکر ہوتا
آپ کیا کہتے ہیں دشمن کے برابر ہو حسن
خوب ہوتا جو میں ان کے برابر ہوتا

غرض کہ حسن کا عام رنگ وہی ہے جو ان کے استاد داغ کا تھا۔ "ثمر فصاحت" (مجموعۂ کلام حسن) میں وہ داغ کا کامیابی سے اتباع کرتے ہیں۔ بانکپن، تیکھاپن، جنسی عشق، واردات، بات میں بات، محاکات وغیرہ جو داغ کی شاعری کی امتیازی خوبیاں ہیں حسن کے یہاں بھی ملتی ہیں کہیں کہیں وہ اس رنگ سے ہٹ کر بھی کہتے ہیں مثلاً ان کی یہ غزل ملاحظہ ہو۔

ہم لگی دل کی بجھائیں کیوں
عشق کو آگ لگائیں کیوں کر

اور اسی طرح کی دوسری غزلوں میں ان کا رنگ داغ سے مختلف ہے۔ حسن کی شہرت نہ صرف غزل گو کی حیثیت سے اردو شاعری میں تسلیم کی جاتی ہے بلکہ نعت گوئی کی حیثیت سے وہ اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

حسن رضا خاں کے زمانے ہی میں نعتیہ مشاعروں کا رواج پڑا ان سے قبل بریلی کے مشاعروں میں بطور ہدیہ تبریک حمد و نعت و منقبت خوانی ہوتی تھی جب حسن کی نعت گوئی نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی اور بریلی میں نعت گوئی کو غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی تب نعت گوئی کے لئے مشاعرے بھی عام طور پر منعقد ہونے لگے اور مقبول ہوتے۔

حسن رضا خاں کے زمانے سے ہی مشاعروں میں مزاح نگاروں نے اپنا کلام پڑھا اس کا آغاز یوں ہوا کہ حسن سے ایک ہزل گو، خنداں وابستہ تھے، اور حکیم عبدالصمد سرشار سے ایک سقہ، جن کا تخلص فلفل تھا، مشاعروں میں ہر دو گردپوں کی طرف سے یہ ہزل گول پیش ہوتے اور سامعین کے لئے انبساط کا سامان فراہم کرتے۔ بحیثیت مجموعی بریلی میں اردو شاعری کا وہ دور جس کا آغاز حسن رضا کے ساتھ ہوا اور جس کا اختتام ۱۹۴۷ء میں ہوا، ایک دلچسپ رنگارنگ اور ہمہ ہمی کا دور تھا۔

حسن رضا خاں کی تعلیم و تربیت، مذہبی ماحول، با عمل زندگی اور شعر گوئی کی فطری صلاحیت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ نعت لکھتے چنانچہ انہوں نے نعت گوئی میں بھی وہ امتیاز پایا کہ باید و شاید۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ "ذوق نعت" (۱۳۲۵ / ۱۹۰۷ء) دسویں بار طبع ہو چکا ہے ان کے تحریر کردہ نعتیہ کلام اور نعتیہ غزلیں برصغیر ہند و پاک میں یکساں طور پر مقبول ہیں حسن کے نعتیہ کلام پر داغ کی اصلاح نہیں ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی مولانا احمد رضا خان نے ضرور ان کی نعتوں کو کبھی کبھار بہ نظر اصلاح دیکھا ہے اور ان کی نعتوں کے مداح تھے مولانا احمد رضا صاحب نے اپنے ملفوظات میں صرف دو نعت گویان اردو یعنی کافی مراد آبادی اور حسن کی تعریف کی ہے۔

حسن عالم دین تھے، نیک اور پرہیز گار مسلمان بھی تھے۔ ان کے سینے میں ایک گداز قلب تھا۔ ان کے صاحبزادے مولوی حسنین رضا خاں نے بتایا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر گرامی سن کر ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ فریضۂ حج انہوں نے وفات سے سات ماہ قبل ادا کیا تھا اور جس مدت میں انہوں نے "ذوق نعت" مرتب کیا ان کی حالت غیر سی رہی اور خاص کیفیت طاری رہی جس کا اظہار ان کی نعتوں میں بار بار ہوا یہ حالت عشق نبی کی وجہ سے تھی جس میں فنائیت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ وہ قلبی کیفیت تھی جس کے اظہار کے لئے غزل سب سے زیادہ موزوں تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتوں میں ان کے جذبات غزل کی زبان اور غزل کی اشاریت کے سہارے اس قدر مقبول ہوئے کہ اردو کی نعتیہ شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے اپنے اس مخصوص انداز کی وجہ سے وہ متقدمین سے زیادہ ممتاز اور مشہور ہوئے۔ انہوں نے اپنی نعتیہ غزلوں میں جذبات، تجربات اور مشاہدات کو نظم کیا اس طرح وہ محض نعت کے نہیں روح نعت کے شاعر تھے۔۔۔ نعتیہ اشعار کے چند نمونے یہ ہیں ؎

نگاہ لطف کے امید وار ہم بھی ہیں
لئے ہوئے یہ دل بے قرار ہم بھی ہیں
ہمارے دست تمنا کی لاج بھی رکھنا
ترے فقیروں میں اے شہریار ہم بھی ہیں
ادھر بھی توسن اقدس کے دو قدم جلوے
تمہارے راہ میں مشت غبار ہم بھی ہیں
کھلا دو غنچۂ دل صدقہ باد دامن کا
امیدوار نسیم بہار ہم بھی ہیں
تمہاری ایک نگاہ کرم میں سب کچھ ہے
پڑے ہوئے تو سر رہگزر ہم بھی ہیں
جو سر پر رکھنے کو مل جائے نعل پاک حضور
تو پھر کہیں گے کہ ہاں تاجدار ہم بھی ہیں
حسن ہے جس کی سخاوت کی دھوم عالم میں
انہیں کے تم بھی ہو اک ریزہ خوار ہم بھی ہیں

دل میں یاد تیری گوشۂ تنہائی ہو
پھر تو خلوت میں عجب انجمن آرائی ہو
آستانے پہ ترے سر ہو اجل آئی ہو
اور اے جانِ جہاں تو بھی تماشائی ہو
بزم آرا ہوں اجالے تری زیبائی کے
کب سے مشتاق ہیں آئینے خود آرائی کے

خاک ہو جاتے اگر تیری تمناؤں میں
کیوں ملیں خاک میں ارمان تمنائی کے

اس دل کے فدا جو ہے تری دید کا طالب
ان آنکھوں کے قربان جنہیں تو نظر آیا

ایسا تجھے خالق نے طرحدار بنایا
یوسف کو ترا طالبِ دیدار بنایا

اے نظم رسالت کے چمکتے ہوتے مقطع
تو نے ہی اسے مطلع انوار بنایا

یہ رفعت پابوس کہ پتھر نے جگر میں
نقش قدم سید ابرار بنایا

اگر قسمت سے ان کی گلی میں خاک ہو جاتا
غم کونین کا سارا بکھیڑا پاک ہو جاتا

وہ کیا مرتبہ ہوا تیرا
تو خدا کا خدا ہوا تیرا

اے چمن بھیک ہے تبسم کی
غنچہ غنچہ کھلا ہوا تیرا

سوکھے گھاٹوں مرا اتار ہو کیوں
کہ ہے دریا چڑھا ہوا تیرا

ذوق نعت کی مثنویوں میں قابل ذکر مثنوی وسائل بخشش ہے جس میں ۶۰۲ اشعار ہیں اور اس میں نعت کے علاوہ مناقب بھی ہیں۔ اس مثنوی کا انداز مثنوی کی فضا کے مطابق غزل سے اور خاص طور پر داغ اسکول کی غزل سے بالکل مختلف ہے۔

حسن بریلوی ایک عمدہ غزل گو، ممتاز نعت نگار اور مثنوی نگار شاعر ہیں۔ انہوں نے بریلی میں جو شمع ادب روشن کی اس کے نور سے آئندہ نصف صدی تک شعراء فیضیاب ہوتے رہے ان شعراء میں حکیم سید برکت علی نامی، منشی دوارکا پرشاد حلم بریلوی، حافظ وہاج احمد، محشر، سید محمود علی عاشق، منشی مظہر حسین مظہر، حکیم سید مسعود غوث فیض، منشی تہور علی تہور، منشی محمد حسین اثر بدایونی اور منشی اعجاز احمد قیصر مراد آبادی وغیرہم کے نام قابل ذکر ہیں۔

(۳)

مولانا عبدالسمیع بیدل رام پوری

نام عبدالسمیع تخلص بیدل ہے۔ بیدل قصبہ رام پور منہیاراں ضلع سہارن پور کے رہنے والے تھے ان کے والد شیخ محمد یوسف مشہور طبیب تھے ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابی ایوب خزرجی انصاری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہو کر نضر بن کنانہ سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں ہیں، جا ملتا ہے۔

پہلے قرآن مجید حفظ کیا اور ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی پھر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ مولانا عبدالسمیع بیدل ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں دہلی پہنچے اور علوم معقول و منقول مفتی صدر الدین آزردہ اور دیگر اکابر علمائے دین سے حاصل کئے انہوں نے فارسی کی تعلیم صہبائی سے حاصل کی، اردو عربی اور حدیث و تفسیر کی آزردہ سے۔ ان کے علاوہ مولانا احمد علی سہارنپوری، مولوی سعادت علی سہارنپوری، مولانا شیخ محمد تھانوی اور مولانا قاسم نانوتوی سے بھی کچھ استفادہ کیا اور علوم مروجہ میں درجہ کمال حاصل کیا۔

مولانا عبدالسمیع بیدل اپنے زمانے کے نامور عالم اور مصنف تھے۔ مؤلف تفسیر ابر کرم لکھتے ہیں:۔

"عالم با عمل مبرا از حرص و امل، عشاق رسول اللہ، اعلیٰ درجہ کے مصنف، حدیث و تفسیر وفقہ میں کمال رکھتے تھے، زہد و تقوی بدرجہ غایت ہے، دیانتدار، متقی، امین، خدا ترس، متین، کم گو، متواضع، بامروت آدمی ہیں۔۔۔ کلمہ خیر کہنے سے درگزر نہیں کرتے، اخلاق بدرجہ غایت، سچ ہے ایسوں ہی کا ہونا زینت اسلام ہے"۔

سات برس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد کسب معاش کا مرحلہ پیش آیا سب سے پہلے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰۔۱۸۶۱ء) میں رڑکی ضلع سہارن پور میں ایک برہمن ٹھیکیدار کے بیٹے ناہر سنگھ کی تعلیم و تربیت پر مامور ہوئے۔ نوجوان ناہر سنگھ نے ان کی بزرگی اور زہد و ورع اور دینداری و تقوی سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا خلیل الرحمٰن ان کا نام رکھا گیا۔ جب یہ خبر ناہر سنگھ کے خاندان تک پہنچی تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ عبدالسمیع کو ملازمت سے برطرف کر دیا ناہر سنگھ پر بھی بہت سختی کی گئی لیکن اس نے استقامت کا ثبوت دیا اور اپنے اعتقاد پر قائم رہا۔

مولانا عبدالسمیع رڑکی سے نکل کر اپنے وطن پہنچے۔ انہیں دنوں میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہندوستان آئے ہوئے تھے مولانا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے حاجی صاحب نے ان کے علم و تقوی سے متاثر ہو کر انہیں اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیا۔ میرٹھ کے رئیس شیخ الٰہی بخش (لال کرتی) نے اپنے بھتیجوں کی تعلیم کے لئے بلا لیا اور انہوں نے وہیں عمر گزار دی شیخ الٰہی کے پوتے شیخ شمس الدین میرٹھی تحریر فرماتے ہیں:۔

> "میرٹھ تشریف آوری سے قبل کچھ عرصہ رڑکی میں قیام پذیر رہے وہاں سے بلدہ میرٹھ بسلسلۂ ملازمت آنا ہوا۔ یہاں جناب شیخ الہی بخش مرحوم رئیس اعظم نے اپنے برادر زادگان شیخ غلام محی الدین صاحب، وحید الدین صاحب اور بشیر الدین صاحب کو پڑھانے کے واسطے حضرت کو متعین فرمایا مولانا نے تقریباً چالیس سال اپنی عمر کا بقیہ حصہ یہیں ختم کر دیا۔۔۔۔ دوران قیام میرٹھ میں آپ کو کلکتہ، کانپور اور ٹونک سے صدر مدرسی مدارس کے لئے وافر مشاہرہ پر بلایا گیا لیکن حضرت نے بوجہ محبت اس خاندان کے انکار کر دیا مولانا بڑے متبع شرع، متقی، عالم، فاضل اہل اللہ میں سے تھے"۔ ۲۲

مولانا عبدالسمیع نے اپنی زندگی کے آخری ۴۲ برس میرٹھ میں بسر کیئے۔ یہیں منگل یکم محرم ۱۳۱۸ھ (۱ مئی ۱۹۰۰ء) کو انتقال کیا۔ قبرستان مخدوم شاہ ولایت کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادے محمد میاں تھے۔ معاصرین بیدل میں بیان یزدانی اور شوکت میرٹھی معروف ہیں۔

تصنیف و تالیف:- مولانا عبدالسمیع بیدل ایک اعلیٰ پایہ کے مصنف تھے تمام عمر مذہبی کتابوں کی تصنیف کرتے رہے مولانا مرحوم کی درجہ ذیل ۱۲ مطبوعات کا پتا چل سکا ہے۔ (۱) دافع الاوہام فی محفل خیر الانام (لکھنؤ ۱۲۹۶ھ) (۲) انوار ساطعہ دربیان مولود و فاتحہ (میرٹھ: ۱۳۰۲ھ) (۳) راحتہ القلوب فی مولد المحبوب (دہلی: ۱۲۹۰ھ) (۴) بہار جنت (میلاد شریف) (کانپور: ۱۳۱۰ھ) (۵) سلسبیل فی مولد ہادی سبیل (میلاد نظم) (میرٹھ: ۱۳۱۲ھ) (۶) نور ایمان (نعتیہ کلام) (میرٹھ

: ۱۳۱۲ھ) (۷) حمد باری (۸) طراز سخن، مجموعہ کلام (میرٹھ : ۱۳۱۴ھ) (۹) جوہر لطیف (نعتیہ مثنوی) (میرٹھ : ۱۳۲۷ھ) (۱۰) فیضان قدسی (فضائل آیۃ الکرسی) (دلی : ۱۳۲۷ھ) (۱۱) وسیلہ مغفرت (مجموعہ ادعیہ) (۱۲) مظہر حق (مسائل دینیہ منظوم) یہ سب کتابیں اردو زبان میں ہیں۔

دافع الاوہام فی محفل خیر الانام: مولانا عبدالسمیع بیدل نے محفل میلاد کی تائید میں یہ رسالہ لکھا ہے اور معترضین کے جواب دیئے ہیں یہ رسالہ اردو نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہے اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے ۔

کر کے مالک کا شکر پڑھ کے درود
کرتا ہوں ذکر محفل مولود
مومنو! یاں ادب سے آؤ تم
عطر خلت بسا کے لاؤ تم
ذکر خیر الوریٰ کی محفل ہے
مولد مصطفیٰ کی محفل ہے
محفل اس شاہ ذی حشم کی ہے
محفل اس شافع امم کی ہے
پھیلا آفاق میں ہے جس کا نور
اسی نور خدا کا ہے مذکور
وصف حضرت کا جان سے دل سے
سنو آکر زبان بیدل سے

اس کتاب کا اختتام مندرجہ ذیل اشعار پر ہوا ہے ۔

جو مری مثنوی کی سیر کریں
میرے حق میں دعائے خیر کریں
مجھ کو حق جس طرح ہوا معلوم
اس صحیفہ میں کر دیا مرقوم
کام اپنا ہے امر حق کہنا
گر معاند لڑے تو چپ رہنا
گر کوئی اس میں رد و قدح کرے
نہیں ہر گز ملال اس کا مجھے
اپنا شیوہ نہیں ہے جنگ و جدل
کس و ناکس سے کرنا رد و بدل
بس سلامت روی ہے کام اپنا
دوست دشمن کو ہے سلام اپنا
صلح کی حق نے دی ہے خُو مجھ کو
مرحبا کہتے ہیں عدو تجھ کو
اب تمامی پہ آیا اپنا کلام
بھیجوں حضرت پہ میں درود و سلام

حمد باری:- فارسی کی ابتدائی نصابی کتابوں میں خالق باری مشہور ہے مگر اس میں سنسکرت، ہندی اور پنجابی کے اکثر ثقیل الفاظ ہیں جن کے سمجھنے میں طلبہ کو دقت ہوتی ہے مولانا عبدالسمیع نے اسی درسی ضرورت کے تحت خالق باری کے طرز پر ایک کتاب حمد باری لکھی۔ رسالہ حمد باری میں مندرجہ ذیل عناوین پر مناجات

منظوم کی گئی ہیں۔ (۱) در بیان آسمان و متعلقات آں (۲) در بیان سال و ماہ وغیرہ (۳) در بیان زمین و انچہ در آنست از معادن و بحار و اماکن (۴) در بیان اثاث البیت یعنی اسباب ضروری خانہ و دیگر عناوین۔

وسلیہ مغفرت:- اس رسالہ میں نماز، ضروری سورتیں، ایمان مجمل و مفصل، چھ کلمات اور ادعیہ ماثورہ مع اردو ترجمہ درج ہیں۔

انوار ساطعہ:- ۱۳۰۲ھ میں بعض علمائے دیوبند و گنگوہ و سہارن پور وغیرہ کی طرف سے یکے بعد دیگرے دو فتوے میلاد و فاتحہ وغیرہ کے رد میں مطبع ہاشمی میرٹھ کے ذریعہ طبع کرا کے شائع ہوتے تو مولانا عبدالسمیع بیدل نے ان فتووں کے رد میں ایک مفصل کتاب "انوار ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ" تحریر فرمائی ان فتووں کے بارے میں خود صاحب کتاب لکھتے ہیں:

> "تیرہویں صدی میں لوگوں کا حال کیا غضب تھا اب چودہویں شروع ہوئی دیکھئے کیا قیامت ہو۔ دنیا میں کیا خرابی اور دین میں کیا مصیبت ہو۔ ۱۳۰۲ھ تیرہ سو دو ہجری میں دہلی کے تین علماء غیر مقلد اور علمائے دیوبند و گنگوہ و سہارنپور کی حسن توجہ سے اور مطبع ہاشمی میرٹھ کی سعی سے ایک فتوی چار ورق پر چھپ کر اکثر اطراف میں تشہیر کیا گیا اس کی لوح سر نوشت یہ تھی (فتوی مولود و عرس وغیرہ)"۔[۲۳]

یہ کتاب میلاد پاک اور فاتحہ وغیرہ کی اثبات میں ہے اور اس میں اس کے مخالفین کی تردید کر کے جواز مولود اور فاتحہ وغیرہ کو عقلی اور نقلی دلیلوں سے ثابت کیا گیا ہے اس کی اثبات میں ان ۳۷ محدثین و فقہا کا ذکر ہے جنہوں نے مولود کو مستحب و

مستحسن فرمایا ہے جواز مولود میں مفتیان حرمین کے فتاوے بھی درج ہیں یہ فتوے عربی زبان میں ہیں اور اس کے علاوہ بغداد کے فتوے بھی ہیں۔

کتاب کے آخر میں حاجی امداد اللہ اور دوسرے مشہور عالموں کی تقریظیں، تصدیقیں اور تائیدیں شامل ہیں اس سے پہلے مناجات ختم کتاب ہے۔

شعروادب:- مولانا عبدالسمیع بیدل ایک اچھے شاعر بھی تھے انہوں نے ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں مرزا غالب سے تلمذ حاصل کیا خواجہ احمد فاروقی صاحب لکھتے ہیں۔

> "شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ بیدل نے ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں مرزا غالب سے تلمذ حاصل کیا"۔ ۲۴

ابتداء میں مولانا بیدل کا رجحان عشقیہ شاعری کی طرف تھا مگر حاجی امداد اللہ کی صاحب سے بیعت کے بعد نعت و منقبت کی طرف رجوع ہوئے ان کا جتنا کلام ملتا ہے نعت و منقبت ہی میں ملتا ہے چنانچہ مالک رام تحریر فرماتے ہیں:-

> "شاعری کے آغاز میں بیدل بھی رسمی غزل کی طرف زیادہ متوجہ رہے لیکن جوں جوں مذہب سے شغف بڑھتا گیا اور بالخصوص حاجی امداداللہ سے بیعت کے بعد نعت و منقبت سے زیادہ مزاولت رہنے لگی"۔ ۲۵

مولانا عبدالسمیع کا بیشتر کلام منظوم ان کی آخری ایام کی بے توجہی کے باعث ضائع ہوگیا۔ ان کے شاگرد جن کا تخلص تسخیر ہے انہوں نے ان کا کلام بڑی محنت سے جمع کر کے اس کو "طراز سخن" کے نام سے ۱۸۹۶ء میں میرٹھ سے شائع کیا۔ نمونہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شرر افشاں ادھر لب ہیں، ادھر آنسو برستے ہیں
تماشا جس طرح برسات میں ہو برق باراں کا

نمود ذرہ بے خورشید کب ممکن ہے اے بیدل
سبب حسن قدم ہے گرمی بازار امکاں کا

بیدل کے یہاں خاکساری بہت بڑی چیز ہے وہ کہتے ہیں ؂

کیا کہوں جو خاکساری میں ہے، اے بیدل بہار
مل کے دانہ خاک میں کیا سبز و رعنا ہو گیا
مت خون پہ بیدل کی کمر باندھ، کہ وہ تو
اک طائر بے بال ہے سو بھی کوئی دم ہے
کوئی صورت نہیں نکلتی ہائے
مدعا کوئی بر نہیں آتا
شبنم کو رونا آتا ہے انجام دیکھ کر
غفلت سے مسکراتا ہے غنچہ گلاب کا
وحدت کی رمز کھل نہ سکے بے فنا ہوئے
دریا سے وصل ٹوٹ کے ہووے حباب کا
تھا ابھی وصل، پھر جو آنکھ کھلی
یار آغوش سے جدا دیکھا
دار فانی میں آدمی کیا ہے
بہتے پانی میں بلبلا دیکھا

کیا کہوں کس کس مصیبت سے چلا پیمانہ رات
چرخ نے گھیرا تھا چکر باندھ کر خمخانہ رات

کیا مصیبت میں کسی کا ساتھ دیتا ہے کوئی
دل کو سمجھے تھے یگانہ، ہو گیا بے گانہ رات
شمشیر الم دیکھ کے غش آتے ہے جن کو
یا رب! مجھے لائیں گے وہ کیونکر تہ خنجر
اگر بلا وہ ہیں تو ہم بھی ہیں جفاکش، دیکھیں
پیچ و خم دیں گے ہمیں آپ کے گیسو کب تک

غم نہیں ہے کہ اضطراب نہیں
جان پر میری کیا عذاب نہیں
دل دیا حق نے وہ کہ ہے بیتاب
آنکھ وہ دی کہ جس کو خواب نہیں
یہاں یہ نوبت کہ سانس گنتے ہیں
وہاں وہ غفلت کہ کچھ حساب نہیں
اپنے عاشق کی بیکلی مت پوچھ
دن کو آرام شب کو خواب نہیں
شعلہ رو تیری گرم خوئی سے
کونسا دل ہے جو کباب نہیں
مختصر یہ حال بیدل کا
تن میں طاقت، جگر میں تاب نہیں

ان کے یہ اشعار ان کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہیں جس کو غالب کی صحبت کا فیض کہا جائے تو بے جانہ ہو گا غالب جیسے استاد کی رہنمائی نے ان کی شاعری کو جلا

بخشی۔ ان کی شاعری میں غالب کا رنگ و آہنگ ہے اور وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اردو شاعری کے لئے اہم مانی جاتی ہیں حالانکہ وہ مذہب سے زیادہ قریب تھے اور انہوں نے اپنی پوری توجہ اس پر ہی مرکوز کر دی تھی۔ کاش مذہب کی طرح غزل گوئی پر بھی دھیان دیا ہوتا تو ان کی شاعری کا کچھ اور ہی رنگ و روپ ہوتا پھر بھی اردو شعر و ادب کی دنیا میں وہ ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

(۴)

مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری

عبدالعلیم نام اور تخلص آسی تھا۔ ان کا تاریخی نام ظہور الحق تھا ابتدا میں وہ عاصی تخلص استعمال کرتے تھے اور بعد میں اپنے پیرو مرشد مولانا شاہ غلام معین الدین کے حکم سے آسی کر دیا۔ مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری ۹؍ شعبان ۱۲۵۰ھ کو سکندر پور ضلع بلیا (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد کا نام حضرت شیخ قنبر حسین قدس سرہ تھا آپ کے جد مادری کے بزرگ حضرت بندگی شیخ مبارک قدس سرہ تھے۔ آسی کا نانہال قاضی پورہ ضلع آرہ (بہار) میں تھا۔ ان کی والدہ ماجدہ حضرت کچھنا بی بی مفتی احسان علی جو آسی کے استاد بھی تھے، کی پوتی تھیں غرض وہ باعزت خاندان کے چشم و چراغ تھے جو عوام و خواص دونوں کا منظور نظر تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی۔

آسی نے عربی کی کچھ ابتدائی کتابیں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی سے پڑھی ان کی ذہانت سے مولانا بہت خوش رہتے تھے، عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے حضرت آسی "خانقاہ رشیدیہ"[۲۶] جون پور ۱۲۶۸ھ میں جا کر ایک عرصہ تک وہیں

پڑھتے رہے۔ اس وقت خانقاہ رشیدیہ جون پور میں آسی کے پیر و مرشد مولانا غلام معین الدین بھی موجود تھے ان سے تعلیم حاصل کی بالآخر حضرت آسی مدرسہ حنفیہ جون پور میں معقول اور منقول کی ساری کتابیں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی سے پڑھیں آگے چل کر وہ خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشیں بھی ہوئے۔ آسی کے مزاج میں خاکساری و انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی ان کا رجحان تصوف کی طرف بھی رہا جس کی شاہدان کی شاعری ہے۔

شعر و ادب:- مولانا عبدالعلیم آسی اردو ادب کی دنیا میں ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ یوں تو ان کی شاعری کے علاوہ ان کی نثری خدمات بھی ہیں لیکن شاعری کے مقابل نہیں ٹھہرتی۔ شاعری کے میدان میں انہوں نے اپنا الگ اور منفرد مقام بنایا۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا یعنی آسی ایک فطری شاعر تھے جون پور سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ ان کی ابتدائی شاعری بھی لائق ستائش اور قابل داد ہے۔ آسی کے وقت کے مشہور شاعر شاہ غلام اعظم فضل الہ آبادی (سجادہ نشیں دائرہ شاہ اجمل الہ آبادی) جو ناسخ کے قریبی شاگردوں میں تھے، ایک بار آسی نے بھی اپنا کلام جون پور کے قیام میں ہی افضل الہ آبادی کو دکھلایا، افضل صاحب نے ان کی غزلوں کو بہت ہی غور و فکر سے دیکھا اور ان کی ذہانت کی داد دی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ اس کے بعد آسی کو اصلاح کی ضرورت نہیں پڑتی تھی مگر ادباً وہ غزلیں افضل صاحب کے پاس بھیجتے رہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے کہ آسی صاحب افضل کے شاگرد ہیں اور افضل صاحب ناسخ کے شاگرد ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آسی کا سلسلۂ تلمذ مشہور زمانہ شاعر ناسخ سے جا ملتا ہے آسی نے اپنے ایک شعر میں اپنے استاد کا ذکر یوں کیا ہے ؎

آسی مغموم کو ہے یاد قول اوستاد
خستگی سبطین کی اے افضل آتی ہے جو یاد

آسی کی شاعری کا موضوع تصوف ہے وہ مسائل تصوف اور تصوف کی باتوں کو قالب شعر میں ڈھال کر لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں لیکن بڑا شاعر بننے کی تمنا انہوں نے کبھی نہیں کی آسی کا یہ شعر اس کا ترجمان ہے ؎

شعر کوئی نہ سمجھنا کہ میرا کام ہے یہ
قالب شعر میں آسی فقط الہام ہے یہ

آسی کے نزدیک شاعری وہی ہے جس میں حقیقت کا بیان مجاز کے ساتھ ہو اور مجاز کا بیان حقیقت کے ساتھ ورنہ وہ شاعری لغو ہے وہ خود فرماتے ہیں ؎

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
وہ شعر لغو ہے آسی کلام ناکارا

آسی نے اپنی شاعری کو لفظی بازی گری میں نہیں الجھایا بلکہ رنگ تغزل سے اپنے کلام کو ہر دلعزیز بنادیا مثلاً ؎

ل بال اپنے اسیروں کے جکڑ لیتے ہیں
کیا غضب ہوتے ہیں زلفوں میں پھنسانے والے

اب کہیں آسی نالاں ہے نہ قیس و فرہاد
کیا ہو کنگرہ ٔ عرش ہلانے والے

آسی اپنے وقت کے عارف کامل اور قادر الکلام شاعر تھے اردو شاعری کی نمایاں خدمات انجام دیتے ہوئے انہوں نے ہزاروں کو فیض یاب کیا جن میں شمشاد لکھنوی، عبدالصمد، سید محمد غازی پوری، احمد حسین لبیب سکندر پوری وغیرہ۔ بہت ممتاز تھے۔

آسی کے کلام کی مجموعی خصوصیت گم گشتگی اور تبتل ہے یعنی سب کچھ چھوڑ

کر محبوب کی طرف نہ صرف آجاؤ بلکہ اسی میں محو ہو جاؤ لیکن یہ محویت کوئی مجہول کیفیت نہیں ہے آسی کے وہاں عشق ایک جداگانہ مذہب ہوگیا ہے اور ان کی شاعری کو اس مذہب کی انجیل سمجھنا چاہیے ان کا پیغام یہ ہے کہ عشق کے بغیر زندگی بے کیف ہے ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

عین عشق ہے وہ دل عاشق عشق جو ہوا
ہائے وہ لوگ جو دل دادۂ صورت بھی نہیں

آسی عشق مجازی اور عشق حقیقی کی بحث میں نہیں پڑتے۔ عشق چاہے کوئی ہو عشق تو ہے جس میں درد دل اور درد جگر کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ عشق آخر ہو کس کے ساتھ؟ یہ اپنے اپنے حوصلہ اور توفیق پر منحصر ہے۔ آسی نے واضح لفظوں میں کہیں یہ تلقین نہیں کی ہے مگر ان کی شاعری کا عام لہجہ اور عام اشارہ یہی ہے کہ عشق مقصود بالذات ہے جو تمام نسبتوں سے بالا تر ہے جو کسی کے ساتھ منسوب ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر وہ شخص جو آسی کے اشعار کا مطالعہ کرتا ہے عام ازیں کہ وہ شعور محبت کی کس منزل پر ہے آسی کی شاعری کو اپنے سے بہت قریب پاتا ہے ؎

آسی مست کا کلام سنو
وعظ کیا پند کیا نصیحت کیا

اسی لیے مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے:-

"مشرق کے صوفی شاعروں میں صرف دو ہستیاں نظر آتی ہیں جنہوں نے مجاز کی حقیقت اور قدسیت کما حقہ، تسلیم کیا ہے اور جن کے مسلک کو "مجازیت" کہا جا سکتا ہے ایک تو حافظ شیرازی، دوسرے آسی.... آسی کے وہاں تصوف اور تغزل حقیقت اور مجاز دونوں ایک مزاج ہو کر نمایاں ہوتے ہیں جس کا

نتیجہ یہ ہے کہ حقیقت والے اس کو حقیقت سمجھتے ہیں اور مجاز والے مجاز سمجھتے ہیں"۔ [۲۷]

آسی کا معیار عشق کیا ہے؟ اس کا اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

عاشقی میں ہے محویت درکار
راحت وصل و رنج فرقت کیا
نہ گرے اس نگاہ سے کوئی
اور افتاد کیا مصیبت کیا

یعنی عشق کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ عاشق معشوق کی یاد میں فنا ہو جائے اور اسے معشوق کے سوا کچھ نظر نہ آئے....

حضرت میر کی شاعری کی خصوصیت درد سے بھری حزنیہ شاعری ہے آسی بھی اسی درد کے قائل ہیں جو میر کی غزل میں پایا جاتا ہے ؎

اس طرح درد سے لبریز جو تقریر نہ ہو
سخن آسی شیدا غزلِ میر نہ ہو

وہ بھی کچھ عشق ہے جو درد کی لذت نہ چکھے
وہ بھی نالہ ہے جو حسرت کش تاثیر نہ ہو

آسی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ تمام آرائش اور تکلف کے باوجود اپنے کلام کو اس تاثیر سے بھر دیتے ہیں جو خلوص اور سادگی سے پیدا ہوتی ہے، تشبیہات و استعارات کی شاعری دنیا میں. بہت کم تاثیر کی شاعری ہو سکی ہے مگر آسی کے دل میں کیفیت پہلے ہوتی ہے اور تشبیہات و استعارات اور دوسرے مناسبات بعد کو سوجھتے

ہیں اسی لئے ان کے تشبیہات و استعارات بھی ان کے جذبات و تاثرات کے لازمی عناصر بن جاتے ہیں اور صورت و معنی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ آسی کے کلام میں تشبیہات، استعارات و کنایات وغیرہ کی بھرمار ہے اس کا ثبوت مندرجہ ذیل کے چند اشعار میں ملتا ہے ؎

شہید ہوں چشم نرگسیں کا، نیاز مند اپنے نازنیں کا
مزا ہے لب ہائے شکریں کا، ہے نام بس قند و نگبیں کا
نہ وصف پوچھو رخ حسیں کا، کہ مخجل چاند چودھویں کا
جو حلقہ ہے زلف عنبریں کا، سو ایک نافہ ہے مشک چیں کا

نہ بات میں کیوں ہو شان شیریں، بنی ہے مصری لسان شیریں
لکھوں جو وصف لبان شیریں، قلم کے صدقے ہو بیان شیریں
نہ کیسے میرا بیان شیریں، ہو جوئے شہد روان شیریں
ز بسکہ وصف دہان شیریں، رہا ہے ورد زبان شیریں
بدن میں جب تک ہے جان شیریں، مزا دہن میں ہے نگبیں کا

چراغ طور اس کے چہرہ سے گل، کمر رگ گل ہے بے تامل
زمین کو چال سے تزلزل، فلک کو پہونچا ہے گھنگرو کا غل
وہ روئے خنداں ہے جان بلبل، قد خراماں سے سرو منفعل
وہ چشم فتاں ہے غیرت گل، وہ زلف پیچاں ہے رشک سنبل
عذار میں ہے صباحت گل، بدن میں عالم ہے یاسمیں کا

ہے سنبل موئے زلف حوراں، جگر میں جو ہے دود پیچاں
ہے نہر تسنیم چشم گریاں، تو رشک طوبیٰ ہے نخل حرماں
جسد کے گل ہائے زخم خنداں، نہ کس طرح ہو نصیب بستاں

ز ہے جوشِ داغِ ہجراں، ہوا مرا سینہ باغِ رضواں
برائے گل گشت جاتے غلماں، خیال پھرتا ہے اک حسیں کا

شمع کے مانند ہے اپنا بھی کیا سوز و گداز
صورت پروانہ دشمن ہم سے جل جاتے ہیں کیوں
مرغ جاں طعمۂ شاہین اجل ہو جاتے
باز ہم عشق سے تیرے نہیں آنے والے
چال آفت ہے تو پازیب کی جھنکار غضب
آئیے فتنۂ محشر کے جگانے والے

ہر ایک لفظ میں ایسی کشش ہے کہ سامع کا دل خود بخود کھنچتا چلا جاتا ہے ساتھ ہی تصوف کی بنیاد عشق حقیقی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ آسی نے کوزے میں سمندر بھر دیا ہے یعنی تفصیل کو اجمال کر دیا ہے یہ خصوصیت بھی ان کی شاعری میں پائی جاتی ہے مثلاً فرماتے ہیں ؎

رات ہے رات تو بس مرد خوش اوقات کی رات
گریۂ شوق کی یا ذوق مناجات کی رات
ہم گدایان در پیر خرابات کی رات
ہے شب قدر سے دعوائے مساوات کی رات
گریۂ غم ہے کہ ساون کی جھڑی تادم صبح
کوئی موسم ہو یہاں رہتی ہے برسات کی رات
اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی
ہے شب گور بھی اس گل کی ملاقات کی رات

وحدت الوجود تصوف کا ایک اہم مسئلہ ہے جس کا مطلب ہے لا موجود الا اللہ
یعنی اللہ کے سوا کسی کا وجود نہیں آسی شاعرانہ رنگ میں فرماتے ہیں ۔

وحدت جسے کہتے ہیں وہی کثرت ہے
کثرت جسے سمجھے ہو وہی وحدت ہے
واصل ہے نہ موصول نہ گنجائش وصل
محفل ہے نہ خلوت ہے عجب صحبت ہے

آسی کو دنیا میں ہر جگہ خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اسی لئے انہوں نے کیا خوب کہا ہے ۔

وہ کیا ہے ترا جس میں جلوا نہیں ہے
نہ دیکھے تجھے کوئی اندھا نہیں ہے

آسی اپنے محبوب کی الفت میں دم نکلنے جانے کی آخری تمنا کرتے ہیں ۔

ہر اک طالب دیں ہے طالب فنا کا
کہ جب ہم نہیں آپ دنیا نہیں ہے
نکل جائے دم اس کی الفت میں آسی
سوا اس کے اب کچھ تمنا نہیں ہے

"بیان جادو ہے" کے تحت آسی نے بھی اپنی شاعری میں جادو جیسی خصوصیت پیدا کر دی ہے جس سے ہر قاری متاثر اور لطف اندوز ہوتا ہے وہ خود فرماتے ہیں ۔

قالب نظم میں جو پھونک دے جان اے آسی
نہ وہ عیسیٰ ہیں نہ موسیٰ، وہ ہمارا دم ہے

شاعر کا خیال ہے کہ سچے عاشق کی تمنا- یہی ہوتی ہے کہ اپنی زندگی معشوق کے در پر ہی گزار دے اور انجام کی پرواہ نہ کرے ۔

صورت نقش قدم بیٹھے ہیں کوچے میں تیرے
دیکھیں کس طرح اٹھاتے ہیں اٹھانے والے

جیتے جی کون ترے در سے اٹھا سکتا ہے
یں اٹھائیں گے جنازے کے اٹھانے والے

آسی کے نزدیک صوفی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ دنیاوی ذات پات کے جھگڑے میں الجھے بلکہ اس کا دھیان صرف اور صرف معشوق کی طرف ہو اور وہ معشوق کے سوا کسی اور کو نہیں جانتا ہو کہ کون اس کا دوست ہے اور کون دشمن، بطور مثال یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

پہچانتا وہ اب نہیں دشمن کو دوست سے
کس قید سے اسیر محبت رہا ہوا

اس کا پتہ کسی سے نہ پوچھو بڑھے چلو
فتنہ کسی گلی میں تو ہوگا اٹھا ہوا

صوفیوں نے اپنے احساس کو اہل دنیا تک پہنچانے اور انہیں سمجھانے کے لئے بہت سے دنیاوی رسم ورواج اور قصے کہانیوں کا سہارا لیا ہے، فارسی کے مشہور شاعر سنائی، فرید الدین عطار، جلال الدین رومی، نظامی، عمر خیام، حافظ، جامی وغیرہ نے صوفیوں کی حقیقت کو بتانے کے لئے یوسف، زلیخا، مجنون، شیریں فرہاد وغیرہ مشہور کہانیوں کا سہارا لیا ہے اور وارداتِ محبت کے اظہار کے لئے ساقی، شراب جام ومینا وغیرہ کا ذکر کیا ہے آسی کے کلام میں بھی ان سب چیزوں کا استعمال ملتا ہے گویا وہ اپنے قدیم صوفی شعراء کے پیرو کار ہیں آسی کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دل سرد ہے خاک گرم جوشی ہوگی
میخوار رہے نہ مے فروشی ہوگی

امید شراب ناب کیسی آسی
دور آخر ہے درد نوشی ہوگی

سمجھتے ہو جوش انا الحق کی موجیں
وہ قطرہ نہیں ہے جو دریا نہیں ہے
وہ دل کیا جو دلبر کی صورت نہ پکڑے
وہ مجنوں نہیں ہے جو لیلیٰ نہیں ہے

آسی صاحب ایک صاحب حال اور صوفی بزرگ تھے اسی لئے ان کے حال میں قال کا مزہ ہوتا ہے اور ان کے قال میں حال کا کیف، ان کی اس کیفیت سے ہر ایک لطف اندوز ہوتا ہے جیسے ؎

حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسی گستاخ کا ہر جرم نا بخشندہ ہے

اس شعر میں حشر، اور اپنی گنہگاریوں کا ایک مرقع پیش کیا گیا ہے لیکن شعر کو جو چیز اسی قبیل کے اور سینکڑوں اشعار سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی بلیغ مجازیت یا تمثیلیت ہے اور اسی نے اس کو ہر شخص کے حالات اور جذبات سے قریب اور مانوس رکھا ہے شاعر نے عارفانہ وجدانات کو عاشقانہ بنا دیا ہے۔

آسی فرسودہ سے فرسودہ الفاظ کو ایسے وقت اور ایسی ترکیب کے ساتھ لاتے ہیں اور اس کے اندر ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ لفظ ہمارے لئے بالکل نیا ہو جاتا ہے بطور مثال ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

غنچے ! تجھے میری دل فگاری کی قسم
شبنم ! تجھے میری اشک باری کی قسم

کس گل کی نسیم صبح خوشبو لائی
بے تاب ہے دل جناب باری کی قسم

"جناب باری" عام اور پرانی اصطلاح ہے لیکن آسی نے نئی معنوی کیفیت سے بھر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں یہ قسم نہ کھائی گئی ہوتی تو شاعر اس حالت کو پوری طرح بیان کر سکتا اور نہ ہم خاطر خواہ اس سے متاثر ہو پاتے۔۔۔

آسی صاحب عاشق رسول ہیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری الفت و محبت ہے اس الفت و محبت کو ظاہر کرنے کے لئے انہوں نے اپنی شاعری میں جدت، دلکشی اور انکساری پیدا کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور ان سے لگاؤ کا ذکر تینوں زبانوں عربی، فارسی اور اردو میں ملا کر پیش کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے بطور مثال مخمس کے ذیل اشعار پیش کئے جاتے ہیں یہ مخمس مولانا جامی کی مشہور زمانہ نعت دلم زندہ شد از وصال محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تضمین ہے۔ (ادارہ) ؎

محال خرد ہے مثال محمد صلی اللہ علیہ وسلم   سر عرش تک پائمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم
یہ پھیلا ہے نور کمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم   جہاں روشن است از جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

دلم تازہ گشت از وصال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

متاع نظر ہے وہ روتے دل آرا   انہیں کا دلِ ناتواں کو سہارا
مری آنکھیں ہوں اور ان کا نظارا   خوشا چشم کو بنگرد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم را

خوشا دل کہ دارد خیال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

عبث درد عصیاں سے کیوں کرا ہے   شفا اس مرض سے اگر اپنی چاہے
تو لازم ہے ذکر نبی میں نبا ہے   خوشا منزل و مسجد خانقا ہے

کہ درد سے بود قیل و قال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بمدحش کلام خدا گشت نازل   به اخبار قرشِ دنی گشت نازل
چو طٰہٰ و یٰس بسا گشت نازل   بوصف رخش والضحیٰ گشت نازل

چو واللیل شد زلف و خال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

روئے صفاخیز وہ زلف وہ تل   ثنا سنج جن کا ہو ارباب دل
یہ ممکن نہیں وصف ان کے ہوں اسے دل   بوصف رخش والضحیٰ گشت نازل

چو واللیل شد زلف و خال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

وہی نور ہے اصل ارکان عالم   انہیں نے بڑھائی ہے سب شان عالم
وہی جسم اطہر ہوا جانِ عالم   بروے زمیں گشت سلطان عالم

کسے کو بود پائمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کوئی عیش دنیا کی حسرت نکالے   کسی کو پڑیں باغ جنت کے لالے
کوئی شمع رویوں ہی سے لو لگالے   بود در جہاں ہر کسے را خیالے

مرا از ہمہ خوش خیال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

خدا ہی مری حسرت دل نکالے   کہیں محو روئے محمد اٹھا لے
دل زار کو وقت آخر سنبھالے۔   بود در جہاں ہر کسے را خیالے

مرا از ہمہ خوش خیال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ہے فخر جہاں آسی ان کے غلامی   اسی میں کمالات کی ہے تمامی
نہیں رہتی ہے پختہ کاروں میں خامی   بصدق و صفائے خیال گشت جامی

غلام غلامانِ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم

آسی کا یہ آخری مخمس علامہ اقبال کے اس شعر کے مترادف ہے ؎

کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

آسی کا یہ شعر بھی کتنا دلکش و پر لطف ہے جو ان کے ماننے والوں میں شہرت حاصل کر چکا ہے ؎

عجب حسرت سے آسی کہہ رہا تھا کل مدینہ میں
شفاعت ہوگی پہلے حشر میں یا مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کس کی

آسی صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کا مقام یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی روز جزا رسول کا نام لینا چاہتے ہیں وہ صرف ان کو ہی پکارنا چاہتے ہیں وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن پاک سے لپٹ جانے کی تمنا کرتے ہیں مثلاً آسی کہتے ہیں ؎

وہاں بھی یہی نعرہ مارا کروں
محمد صلی اللہ علیہ وسلم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پکارا کروں
قیامت کے دن جب اٹھوں خاک سے
لپٹ جاؤں میں دامن پاک سے
نہ جنت کی خواہش نہ دوزخ سے ڈر
رہے آپ کا جلوہ پیش نظر
تمنا نہیں دل میں اس کے سوا
علیک الصلوٰۃ اے نبی الوریٰ

آسی کا مندرجہ ذیل شعر، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے، کچھ لوگوں کے اعتراض کا سبب بنا رہا ؎

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

اس میں اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ خدا کو مجسم بتایا گیا ہے جو سراسر کفر و شرک ہے لیکن یہ معترضین کی غلط فہمی ہے کیوں کہ اس شعر میں "مستوی عرش ہے" کا جملہ ہے نہ "مستوی عرش تھا" ہے۔ اگر مستوی عرش تھا ہوتا تو اعتراض بجا ہوتا چنانچہ مولانا شاہد علی علیمی قدس سرہ، (سابق سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جون پور) تحریر فرماتے ہیں ؂

> "حضرت (آسی) کا ایک مطلع ہے جس پر کم علم مولویوں نے کفر اور شرک کا فتویٰ دینے سے دریغ نہیں کیا۔ حضرت نے جب یہ غزل کہی تھی میں خدمت میں حاضر تھا مطلع یہ ہے ؂
>
> وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر
> اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر
>
> جب یہ مطلع فرمایا تو میری طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ میاں شاہد! جہلا اس شعر پر اعتراض کریں گے مگر ان کے اعتراض کا جواب مصرعتہ اول میں موجود ہے یعنی وہ اب بھی مستوی علی العرش ہے افسوس کہ اگر معترضین حضرت شیخ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فصوص الحکم وغیرہ دیکھے ہوتے تو اس گستاخی کی جرآت نہ ہوتی اگر مصرعتہ اولیٰ میں "وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر" ہوتا تو البتہ ان کا اعتراض خدا کے مجسم ہونے کا صحیح ہوتا، وہ تو اب بھی مستوی علی العرش ہے۔ مدینہ میں اترنا باعتبار نزول صفات کے ہے جیسے آفتاب آئینہ میں اترتا ہے الان ما کان"۔ [۲۸]

آسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سلام بھی پیش کئے ہیں ان کا یہ سلام ؎

وہاں پہونچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

بہت ہی مشہور ہے اس کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر صاحب لکھتے ہیں:-

"اس سفر (بسلسلۂ مقدمہ کراچی) میں رات کے طول طویل گھنٹے درود و سلام کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیئے اور آسی غازی پوری کا یہ شعر سارے سفر میں برابر وردِ زبان رہا ؎

وہاں پہونچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد"[۲۹]

آسی صاحب کے سلام کے چند اشعار یہ ہیں ؎

نسلام خدائے زمین و زماں
نثار [illegible] سید مرسلاں
سلام مسلسل چو زلف میری
نثار سر چتر پیغمبری
سلام صفا خیز آب حیات
فدائے جناب شہ کائنات
سلام اے دوائے دل درد مند
سلام اے مسیحائے دل خستگاں
سلام اے گل گلشن اصطفا
سلام اے نسیم بہار صفا

سلام اے سفر کردہ لا مکاں
سلام اے مکین دل عاشقاں
سلام اے مرے غم کے تم غم گسار
سلام اے گنہ گار امت کے یار

آسی کے تصوف نے درد کی طرح غزل کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ شاد عظیم آبادی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے درد کے نظریہ کو ہی اپنایا ٹھیک اسی طرح آسی نے بھی اپنا کلام صوفیانہ انداز میں پیش کیا، فراق گورکھ پوری کے بقول:

"شاد کے شعر درد میں ڈوبے دکھائی پڑتے ہیں تو حضرت آسی پریم کی مستی میں نعرے مارتے ہوتے دکھائی پڑتے ہیں" [۳۰]

آسی کی غزل گوئی کی اہمیت اس سے بھی لگائی جا سکتی ہے کہ آسی کے شاگرد عبدالصمد نے جب اپنے استاد کی غزل غالب کو سنائی تو غالب سنتے ہی رہ گئے غالب نے ان کی غزل کی تعریف کی۔ آسی غالب کی شاعری سے بے حد متاثر تھے اسی لئے انہوں نے غالب کے مطلع پر مطلع کہا ہے ؎

غالب کا مطلع ہے ؎

سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

اسی پر آسی کا مطلع یہ ہے ؎

وائے محرومی یہاں شوق شہادت دل میں ہے
جوش آب زندگانی خنجر قاتل میں ہے

غالب کا مطلع ہے ؎

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اس پر آسی کا مطلع یہ ہے ؎

قطرہ وہی کہ روکشِ دریا کہیں جسے
یعنی وہ میں ہی کیوں نہ ہوں تجھ سا کہیں جسے

آسی نے مومن کی غزل پر بھی ایک غزل کہی ہے وہ یہ ہے۔

مومن ؎

آنکھیں جو ڈھونڈھتی تھیں نگہ ہائے التفات
گم ہو یا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا

آسی نے اس مضمون کو اس پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

پیمانہ [illegible] نگاہ سے آخر چھلک گیا
سر جوش ذوق وصل تمنا کہیں جسے

اگر ان کے دیوان کا کچھ حصہ تلف نہ ہوا ہوتا تو بہت سی اس طرح کی غزلیں دستیاب ہوتیں آسی کے کلام کا مجموعہ جو میر کے چھ دیوان سے بھی زائد تھا سیوان (صوبہ بہار) میں تلف ہو گیا وہ بہت پہلے کا کلام تھا۔ پہلے کا کچھ ہی کلام دستیاب ہو سکا۔ باقی کلام کا مجموعہ دیوان آسی مسمی بہ "عین المعارف" ہے جو پاکستان، کراچی سے بھی شائع ہو چکا ہے ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اس میں غزل، مخمس، مثلث، سلام، قصیدہ، قطعہ تاریخ اور رباعی ہیں۔

آسی نے غزل، رباعی اور مثلث کے علاوہ کسی اور صنف کی طرف توجہ نہیں کی دو قصیدے کہے ہیں جن میں ایک تو نواب کلب علی خاں والی رام پور کی شان میں ہے اور مکمل ہے دوسرا میر محبوب علی خاں نظام دکن کی مدح میں ہے جو نا تمام ہے

ان قصیدوں میں فنی اعتبار سے کوئی بات قابل لحاظ نہیں ہے البتہ تشبیب دونوں قصیدوں کی خوب ہیں مثلاً نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور کی شان میں قصیدہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں ۔

کہاں ترا کوئی بحر و جود میں ثانی
حباب دیدہ اہل نظر میں ہے پانی

نہ فرق سوجھے اگر ظاہر و مظاہر ہیں
کسے کہے کوئی باقی کسے کہے فانی

[illegible] دیکھتے ہیں [illegible] ہمہ جمع بجمع
[illegible] سمجھتے رہے [illegible] پریشانی

[illegible] تعین تو [illegible]
[illegible] غنچہ [illegible]

[illegible] بہار سب گل سے [illegible]
یہ شور گلشن [illegible]

درخت پھل سے ہے پیدا تو ہے درخت میں پھل
یہ میری تیری ہے پیدائی اور پنہانی

اگر یہ ہم ہیں تو کیا تیری ذات ہے محدود
اگر یہ تو ہے تو کیا پھر وجود امکانی

اگر یہی ہے تو وہ شوق دید کس کا تھا
جواب تند سے کی کس نے شعلہ افشانی

مخل نہ جب ہوئی وحدت میں کثرت عالم
تو کیوں شریک قدم ہو ثبوت اعیانی

زوال صورت اشیاء ہے صورت ہمہ اوست
غرض کہ ہیچمدانی ہوئی ہمہ دانی

مآل سعی نگاہ کمال تحقیقات
نہ خاک کچھ نظر آیا بغیر حیرانی

اخیر یہ کہ نہ پہچانتے کے قالب میں
وہ ذات پاک گئی آشنا سے پہچانی

مجھے امید سکون و قرار کیا اس سے
جو اپنے جلووں کو رکھتا ہو آنی و فانی

ابھی تو وجد میں لاتا ہوں عقل اول کو
وہ چھیڑتا ہوں میں آہنگ مطلع ثانی

زہے طراوش جوش شیون احسانی
ظہور خاص کو خوش آتی وضع انسانی

حباب گنبد گردوں میں یہ اشارہ ہے
ہوا کی طرح ہے آنا ترا یہاں آنی

آسی کے مثلث شاعری بھی اپنی مثال آپ ہے۔ مثلث بردوہہ ہندی یعنی ہندی دوہے پر مثلث کو دھیان میں رکھ کر، آسی نے ان کی تخلیق بھی کی ہے۔ مثلث اردو و ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں ایک بند میں تین مصرعے ہوتے ہیں ان تینوں مصرعوں کے آپسی تعلق کی بنیاد پر اس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں کبھی تینوں مصرعے ایک ہی ردیف اور قافیے میں ہوتے ہیں تو کبھی پہلے دو مصرعے ایک ردیف اور ایک قافیہ میں اور تیسرا مصرع الگ ہوتا ہے لیکن مثلث کے سبھی بندوں کے تیسرے مصرعے ایک ہی ردیف اور قافیے میں ہوتے ہیں۔ آسی کے بند مثلث

کے دو مصرعے ایک ردیف اور قافیے میں لکھے گئے ہیں اور ہر بند کا تیسرا مصرع ایک ایک ردیف اور قافیہ میں لکھا گیا ہے۔

آسی کے مثلث کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہر بند کے دو مصرعے ہندی دوہے پر لکھے گئے ہیں اور ہر بند کا تیسرا مصرع اردو زبان میں لکھا گیا ہے ان مصرعوں کی زبان اودھی ہے چونکہ آسی کا تعلق جون پور سے تھا اس لئے ان پر بھی جون پور کے آس پاس کی اودھی زبان کا اثر ہے مثلاً یہ مثلث ملاحظہ ہو ۔

ماں راکھوں من جرے کہوں تو مکھ جر جائے
گونگے کا سپنا جیسو سمجھ سمجھ پچھتائے
مقام گومگو ہے سوزش غم بھی جلاتی ہے

ہم تم سامی ایک ہیں کہن سنن کو دوئے
من کو من سے تولئے دو من کبھی نہ ہوئے
ملا جب دل سے دل پیارے دوئی پھر کب

کاجر دوں تو کر کرائے سرما دیا نہ جائے
جن نینن ماں پیو بسیں دوجا کون سمائے
پری بھی ہو تو نظروں میں ہماری کب سماتی

نین رکت پاتی لکھوں جو پی ہوئے بیمار
اچھر بن کاگد چڑھوں دیکھوں داس تہار
عجب خون جگر یہ بے بسی ہم کو کھلاتی ہے

میں چاہوں کہ اڑ ملوں اور پر بن اڑا نہ جائے
کا کہوں کرتار کو جو پر نا دیا لگائے
کوئی تدبیر ملنے کی نہیں ہم سے بن آتی ہے

آسی کی یہ نئی طرز تخلیق ہندی دوہے پر اردو کا ایک مصرع جوڑ کر مثلث کی ایجاد ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے فرق کو مٹانے کے لئے ایک بے مثال قدم ہے۔ اس طرز کے ذریعہ دونوں زبانوں میں ایک ایسا تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے جس کی آج ہمارے ملک اور معاشرے کو ضرورت ہے۔

آسی نے فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور بڑے عمدہ شعر کہے ہیں۔ ان کی شاعری کے علاوہ ان کی نثری خدمات بھی ہیں۔ ان کے تین رسالوں کے علاوہ کوئی یہ دیگر نثری تصنیف کا پتہ نہیں چلتا وہ تین رسالے یہ ہیں (۱) میزان الصرف جو فن صرف میں ہے (۲) فوائد صدیقیہ جو فن نحو میں ہے (۳) فوائد جوہریہ جو فن منطق میں ہے۔ ان رسالوں کے علاوہ آسی نے بہت سے حاشیے اور شرحیں بھی لکھی ہیں جو غیر مطبوعہ اور نایاب ہیں۔

اردو زبان میں آسی کی خطوط نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں جن کا اردو ادبی خدمات میں شامل کیا جانا بے جا نہ ہوگا۔ ان کے خطوط میں مرزا غالب کی طرز تحریر اور ان کا رنگ و آہنگ ہے کیوں کہ آسی نے غالب کا زمانہ پایا تو ان کی طرز تحریر سے متاثر ہوتے جس کی جھلک آسی کے اس خط سے ملتی ہے جس میں اپنی نواسی عزت بی بی عرف بہنی صاحبہ کے نام لکھتے ہیں:-

"عزت بی بی

بسمہ و حمدہ، نور بصر مد عمرہ

آج منگل ہے۔ سنیچر کے روز میں بہمن برہ میں آستانہ بوس خانقاہ و درگاہ ہوں، طبیعت جیسی غازی پور میں تھی ویسی ہی ہے، بہمن برہ میں تمہارا خط پایا، اس کے قبل دس روپیہ سکندر پور سے میں بھیج چکا تھا، مولوی رفیع اللہ کے ذریعہ سے تم کو مل گیا ہوگا دس روپیہ آج بھیجتا ہوں اس میں سے پانچ روپیہ تم لے لینا اور پانچ روپیہ

سید حسین کے دوا علاج کے واسطے اپنی نانی کو دے دینا اور کہہ دینا کہ دوسرے خرچ میں خرچ نہ کریں۔ سب کو میری دعا کہنا۔ اس وقت زیادہ لکھنے کی فرصت نہیں۔

محمد عبدالعلیم

بروز سہ شنبہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ"۔

آسی کے اور بھی کئی خطوط ہیں جن سے ان کی خطوط نگاری پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ آخری سانس تک اردو ادب کی نمایاں خدمات انجام دینے کے بعد ۲ جمادی الاولیٰ، ۳۳۵ھ اتوار کے دن انتقال کر گئے۔

(۵)

مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش

مرتضیٰ احمد خان نام تخلص میکش تھا۔ ماہ محرم ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ والد ماجد کا نام مرید الدین احمد خاں تھا۔ مولانا میکش کے اجداد میں سے جناب گل محمد، جن کا تعلق افغان قوم کے قبیلہ محمد زئی درانی سے تھا ۱۸۰۰ء میں افغانستان سے ہجرت کر کے جالندھر تشریف لائے ان کی اولاد نے علوم کی نشر و اشاعت میں بڑا اہم کردار نبھایا۔

مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مرید احمد خاں سے حاصل کی اس کے بعد جالندھر کے اسکول میں پڑھتے رہے پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور کے کالج میں داخل ہوئے اور دو سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک آزادی میں حصہ لینے کے لئے کالج چھوڑ کر چلے گئے اور ایک سال کے بعد لاہور واپس آ گئے اور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۵۵ء تک مختلف روزناموں میں ایڈیٹر کی

حیثیت سے کام کیا اور ملک کی علمی و ادبی تحریکوں کے علاوہ آزادی کی جنگ میں بھی حصہ لیا اور صعوبتیں برداشت کیں۔ اور عمر کے آخری ایام بڑی تنگی اور پریشانی میں گزارے مگر عزم و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھٹا مظہر الدین نے ان کی مستقل مزاجی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:-

> "مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک دن میں اپنی زندگی کی ناہمواریوں سے تنگ آکر پریشان بیٹھا تھا کہ خضر آئے اور مجھے تسکین دے کر چلے گئے"۔[۳۱]

مولانا میکش مایہ ناز صحافی، بلند پایہ ادیب، ملت اسلامیہ کے بے باک ترجمان اور تحریک آزادی کے سرگرم رکن تھے۔ جمعیۃ العلماء (پاکستان) کے مشیر قانونی اور قائد تحریک ختم نبوت مولانا ابوالحسنات قادری کے رفیق خاص تھے۔ ۱۹۴۰ء میں شہر بنارس میں آل انڈیا سنی کانفرنس منعقد ہوئی تو مولانا ابوالحسنات میکش کو اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ جہاں وہ خصوصی اجلاس میں شریک ہوئے اور کچھ قراردادیں بھی پیش کیں جو اتفاق رائے سے منظور ہو گئی تھیں۔

تصنیف و تالیف = مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے اردو، فارسی دونوں میں اپنی ذہنی صلاحیتوں کا ثبوت پیش کیا اور اہم کتابیں تصنیف کیں۔ جب کابل سے لاہور واپس آئے تو ۱۹۲۲ء سے ۱۹۵۵ء تک مختلف روزناموں میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ہفت روزہ افغانستان (جو فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا) میں انگریزی استعمار کے خلاف مقالے لکھے جس کی بنا پر ۱۹۳۱ء میں ایک سال تک جیل میں رہے لیکن جب جیل سے واپس ہوئے تو پھر ان کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں اور ان کی ادبی و سیاسی دلچسپی میں کوئی کمی نہ آئی۔ انہوں نے لاہور سے نکلنے والے روزناموں مثلاً

زمیندار، احسان، شہباز، مغربی پاکستان اور نوائے پاکستان میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا اور غیر ممالک سنگاپور، ملایا اور برما وغیرہ کا تن تنہا سفر کیا۔ ان بے باک صحافی کے قلم کی تعریف کرتے ہوئے شیخ اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:۔

"اپنے زمانے میں لاہور کی صحافت میں ان کا طوطی بولتا تھا"۔ ۳۲

اس کے علاوہ انہوں نے اردو زبان وادب کی گرانقدر خدمت اپنی تصنیفات سے کی ہے ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱ ------ الہامی افسانے، اردو زبان میں قرآنی واقعات کی روشنی میں یہ افسانے لکھے گئے ہیں	(مطبوعہ لاہور)
۲ ------ ابرز شکن گرز عرف مرزائی نامہ	(فارسی)
۳ ------ اخراج اسلام از ہند	(فارسی)
۴ ------ تقدیر و تدبیر	(اردو)
۵ ------ تاریخ اقوام عالم دو جلد	(اردو)
۶ ------ تاریخ اسلام چار جلد	(اردو)
۷ ------ اسلام اور معاشی حالات	(اردو)
۸ ------ دود دل مطبوعہ	(مجموعہ کلام اردو)
۹ ------ مجموعہ کلام فارسی	(غیر مطبوعہ)

اردو زبان میں ان کی ایک اہم نثری کتاب "الہامی افسانے" ہے یہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں موجود ہے اس کا نمبر دستہ ۳۱۴۷ ہے یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ یہ افسانے قرآنی واقعات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ مولانا میکش کا اسلوب نگارش مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب سے بہت قریب ہے۔ مولانا آزاد نے جس طرح گراں بار الفاظ کا استعمال کیا ہے اسی طرح

میکش نے بھی کیا ہے غرض دونوں کی تحریریں ملتی جلتی ہیں۔ ان کی مادری زبان فارسی ہونے کی وجہ سے ان کی تصانیف میں فارسی رنگ غالب ہے ذیل میں میکش صاحب کی کتاب "الہامی افسانے" سے نمونہ کے طور پر ایک عبارت نقل کرتا ہوں جس سے ان کے طرز تحریر کا اندازہ ہو گا۔

> "آج سے ہزارہا سال پیشتر ریگستان عرب کے بادیہ نشین نے عالم رؤیا میں دیکھا کہ وہ اپنے اکلوتے لخت جگر کے گلے پر چھری پھیر رہا ہے وہ خدا کا ایک مقبول و برگزیدہ بندہ تھا۔ اس نے خیال کیا کہ میرا پروردگار اپنے بندے سے کسی قربانی کا طلبگار ہے چنانچہ اس نے صبح اٹھ کر اونٹوں کا ایک گلہ ذبح کیا۔ اور گوشت مسکینوں میں تقسیم کر دیا۔
>
> دوسری رات پھر اس نے عالم خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے مالک حقیقی کی قربانگاہ پر اپنے اکلوتے دلبند کو لئے کھڑا ہے۔ اس کے خواب ہمیشہ سچے ہوا کرتے تھے۔ اس نے خیال کیا کہ میرا مولا مجھ سے مزید قربانیوں کا طالب ہے اس لئے صبح اٹھ کر اس نے اونٹوں کا ایک اور گلہ ذبح کر ڈالا اور گوشت بھوکے مسکینوں میں تقسیم کر دیا۔
>
> تیسری شب پھر اس نے عالم رؤیا میں یہی ماجرا دیکھا اور اپنے پروردگار کی آواز سنی کہ ہم تیرے بیٹے اسماعیل کی قربانی چاہتے ہیں خدا کا یہ برگزیدہ بندہ اس آواز کو سنتے ہی بستر سے اٹھ بیٹھا اور سب سے پہلے اس نے اپنے مولا کی بارگاہ میں سجدۂ شکر ادا کیا اور گزشتہ دو دن کی اجتہادی لغزش پر معافی مانگی۔

> صبح ہوئی تو اس نے اونٹوں، بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں سے منہ موڑ لیا اور اپنے دلبند سے مخاطب ہو کر کہا کہ میرے مولا نے تمہیں اپنے پاس بلایا ہے اور میں تمہیں اللہ کی راہ میں قربان کرنے والا ہوں۔
>
> ننھے بچے کو اپنے پروردگار اور اپنے باپ کی دوستی کا علم تھا وہ اس بلاوے پر بہت خوش ہوا اس کے رخسار خدا کی راہ میں قربان ہونے کی خوشی سے تمتما اٹھے۔
>
> خدا کے اس برگزیدہ بندے کی سعادت مند بیوی کو بھی اپنے شوہر اور اپنے خدا کے دوستانہ رشتہ کا علم تھا جب اس نے باپ اور بیٹے کی اس خوشی کا ماجرا سنا تو وہ بھی قربانی کی یہ نئی عید منانے میں ان کے شریک ہو گئی۔
>
> صحرا نشینوں کے گھر عید منائی جانے لگی اور شوہر بیوی اور ان کا اکلوتا بیٹا تینوں اس نرالی قربانی کے لئے اپنی اپنی جگہ پر تیاری کرنے لگے"۔ [۳۳]

مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش نثر نگاری کے علاوہ شعر و ادب سے بھی ذوق رکھتے تھے وہ ایک قادر الکلام فطری شاعر تھے اردو میں ان کا مجموعہ کلام مطبوعہ ہے جس کا نام "دودِ دل" ہے۔

ان کی ان اردو خدمات کی بدولت انہیں اردو کا ممتاز صحافی، معروف ادیب و شاعر کہنا بے جا نہ ہو گا۔ انہوں نے اردو کے سرمائے میں گرانقدر اضافے کیے ہیں۔

آخر کار مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش ۲۷ جولائی (۱۳۷۹ھ / ۱۹۵۹ء) کو دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

(۶)

مولانا سید محمد سیدؔ کچھوچھوی

نام سید محمد، تخلص سیدؔ تھا۔ ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء چہار شنبہ کے دن نماز فجر سے پہلے قصبہ جائس ضلع رائے بریلی (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد سید نذر اشرف تھے۔ والدہ ماجدہ سیدہ محمدی خاتون بنت اعلیٰ حضرت اشرفی میاں تھیں۔ سید صاحب اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اور ان کی دو بہنیں تھیں (۱) سیدہ احمدی خاتون (۲) محترمہ سیدہ صاحبہ۔

مولانا سید محمد سیدؔ کے آبا و اجداد ملک ایران سے ہندوستان آئے تھے جس کا اجمالی واقعہ یہ ہے کہ حسینی سادات کا ایک قبیلہ ملک سمنان جو اس وقت ایران کے دار السلطنت تہران کے قریب واقع ہے، کے تخت و تاج کا مالک تھا سیادت و قیادت وراثت میں ملی تھی اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی (متولد ۷۰۸ھ) قدس سرہٗ تھے انہیں ۷۲۲ھ میں ملک سمنان کا بادشاہ مقرر کیا گیا۔ دس سال تک حکومت کرنے کے بعد اپنی پچیس سالہ عمر ہی میں تخت و تاج کو ٹھوکر مار دی اور روحانیت سے محروم انسانیت کی فلاح و اصلاح کے لیے اپنے وطن کو خیر آباد کہا اور پھر مختلف ممالک کا دورہ کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے یہاں کچھوچھہ، فیض آباد میں بود و باش اختیار کر لی۔ سو سالہ زندگی میں شاہ سمناں کو جہانگیر، محبوب یزدانی، غوث العالم، اوحد الدین، تارک السلطنت جیسے القابات سے نوازا گیا۔ حضرت شاہ علاء الحق پنڈوی جیسے معظم شخص سے شرف بیعت و ارادت حاصل ہوئی۔ حضرت خواجہ بندہ گیسو دراز، حضرت مخدوم شاہ مینا، حضرت شیخ علاء

الدولہ سمنانی، حضرت خواجہ حافظ شیرازی، حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند، حضرت امام عبداللہ یافعی، حضرت سید جلال بخاری وغیرہ جیسے علما و صوفیا، مخدوم سمنانی سید اشرف جہانگیر سمنانی کے معاصرین میں سے تھے۔ سلطان سید اشرف جہانگیر کی ذات سے منسوب "خاندان اشرفیہ" کے پہلے فرزند کی حیثیت سے حضرت نورالعین کا نام آتا ہے اور پھر یہیں سے سادات حسینی نے اس قبیلے کو سادات اشرفیہ کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ اسی خاندان کے چشم و چراغ مولانا سید محمد سید کچھوچھوی ہیں۔

مولانا سید محمد سیّد کے دادا شاہ سید فضل حسین اشرف نے ان کو بسم اللہ پڑھائی ان کی والدہ نے چھ ماہ میں پارہ عم یعنی قرآن مجید کا تیسواں پارہ ختم کرایا اور پھر انتیس دن میں باقی ۲۹ پارے پوری روانی کے ساتھ ختم کروائے۔ ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں مکمل کی اس وقت مروجہ فارسی کی تمام متداول کتابیں پڑھیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ نظامیہ فرنگی محلی لکھنؤ میں داخل ہوئے اور فضیلت کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنؤ سے علی گڑھ آکر مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے منطق و فلسفہ کی ادق اور نایاب کتابیں پڑھیں۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے ان کو سندِ فراغت میں "علامہ" تحریر کیا۔ اس کے بعد پیلی بھیت گئے اور مولانا وصی احمد محدث سورتی سے صحاح ستہ، مؤطا، معانی الآثار وغیرہ حدیث کی کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھا اور سندِ حدیث حاصل کی پھر بریلی (یو پی) آئے اور مولانا احمد رضا خان بریلوی سے فتاوی نویسی کا فن حاصل کیا وہاں سے بدایوں گئے تو مولانا عبدالمقتدر بدایونی سے سندِ حدیث ملی اس محنت و جانفشانی کے بعد مولانا سید محمد "محدث اعظم ہند" کے نام سے مشہور ہوئے۔

ان تمام علمی و تحقیقی منازل کو سترہ سال کی عمر میں عبور کر لیا اس کے بعد دلی آئے اور مولانا سید محمد میاں کی سرپرستی میں مدرسۃ الحدیث قائم کیا اور کئی سال تک حدیث پڑھائی قانون شیخ، رسالہ قشیریہ جیسی کتابیں بھی ان کے زیر درس رہیں تصوف و طب کی بھی تدریس جاری رکھی۔ تصنیف و تالیف سے بھی لگاؤ رہا اور اپنے مخالفین کی تحریک کی بیخ کنی کرتے رہے۔

مولانا سید محمد بیک وقت عالم، ادیب، خطیب، صوفی، شاعر، محدث اور پیر طریقت تھے۔ پورے سال تبلیغی دوروں میں مصروف رہتے پانچ ہزار سے زائد غیر مسلموں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ سندھ و ہند، عرب و عجم کے علاقوں کا تبلیغی دورہ کیا اور لوگوں کو راہ ہدایت پر لگایا مولانا نے نہ صرف اپنی خطابت سے اسلام کی تبلیغ کی بلکہ تحریر کا بھی سہارا لیا۔ چنانچہ کتابوں کی تصنیف کے ساتھ ساتھ انہوں نے ۱۹۲۲ء میں کچھوچھہ سے "اشرفی ماہنامہ" جاری کیا جو اردو زبان میں تھا اس کے ذریعہ انہوں نے دین اسلام کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

مولانا سید محمد صاحب نے اپریل ۱۹۴۶ء میں بنارس میں ایک عظیم الشان سنی کانفرنس کرانے کے لئے کلیدی رول ادا کیا۔ وہ اس کے صدر رہے۔ بنارس کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں مولانا نے فرمایا:

> "ہم وہ دن دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارا ہر فرد مبلغ ہو، ہماری پرانی تاریخ یہی تو تھی کہ بادشاہ مبلغ، رعایا مبلغ، پیر مبلغ، مرید مبلغ، سوداگر مبلغ، مزدور مبلغ۔ کوئی مثال ہے کہ صحابہ کرام سے دولت ایمان پانے والا مبلغ نہ ہوا، تبلیغ تو اسلام کا اصل سرمایہ ہے یہ جملہ خطبات آل انڈیا سنی کانفرنس سے دوبارہ دیکھا جائے؟۔ یہودیت نے سازش کے سوا کیا دیکھا تھا۔ نصرانیت

کا منتر "دو کا ایک اور ایک کا تیسرا والا کان کے سو میدان میں
بجنے والا سب تھا"

مولانا سید محمد سید صاحب کو دین متین سے گہری الفت و محبت تھی۔ جس کا اندازہ اس خطبہ صدارت سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں مسلمانوں کے عائلی قوانین کے لیے جو ایکٹ بنائے گئے اس کے منفی اثرات پر مولانا کی نگاہ پہنچی اور انہوں نے اس وقت کھل کر مطالبہ کیا کہ حکومت مسلمانوں کے عائلی قوانین اور تنازعی امور کے تصفیہ کے لیے اسلامی "دارالقضاۃ" بنائے

وہ سیاسی امور میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے لیکن ان کے نزدیک اس سیاست کی کوئی حیثیت نہیں جس میں مذہب واصول کا دخل ہو۔ آزادی کی تحریک ہو کہ خلافت کی تحریک، شدھی تحریک ہو کہ قادیانی فتنہ ہر محاذ پر مولانا سید نے اپنی ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ حکومت برطانیہ نے جب کبھی بھی ملک و ملت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو مولانا نے سخت الفاظ میں اس کی مذمت کی۔ مولانا کی سیاسی بصیرت دیکھ رہی تھی کہ شدھی تحریک کا ایک مقصد ہندوستان کو جارح ہندو فرقہ پرستوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے سوا کچھ نہیں ہے یہ جتنے بھی فتنے برطانوی اور سامراجی قوتوں نے ہندوستان میں ابھار رکھے تھے سب کی کڑی "برمنگھم پیلس" ہی سے جا کر ملتی تھیں لہذا انہوں نے مسلمانوں کو اس کے فتنہ سے آگاہ کیا اور اپنے میگزین "ماہنامہ اشرفی" کے ذریعہ تمام فتنوں اور سازشوں کی دھجیاں اڑا دیں ملک کے طول و عرض کے دورے کر کے لوگوں کے دلوں میں علم کا چراغ روشن کیا۔ سید صاحب آل انڈیا سنی کانفرنس، جماعت رضائے مصطفیٰ اور الجمعیۃ الاشرفیہ کے تاحیات صدر رہے۔ انہوں نے ملت اسلامیہ کی سماجی، اقتصادی، تعلیمی، دینی اور سیاسی امور میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

سید صاحب کو اپنے ملک ہندوستان سے بے حد پیار تھا چنانچہ تقسیم ہند کے بعد

۱۹۵۳ء میں پاکستان کے سب سے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں بذات خود ایک خط لکھ کر مولانا سید محمد سید کو پاکستان کے آئین ساز ادارے کی چیئرمین شپ کی پیشکش کی تھی اور مستقلاً پاکستان میں رہنے کی گزارش کی تھی مگر انہوں یہ کہہ کر انکار کر دیا:

> "آئین ساز ادارے کی صدارت کی پیش کش کا شکریہ، فقیر کے لئے ہندوستان میں قیام، ملت اسلامیہ کے لئے از حد ضروری ہے خواجہ ہند کے ہندوستان کو میں نہیں چھوڑ سکتا فقیر سماتا نہیں ہے تقاضا ہوا ہیل ہے اس کے ایک حوالہ ہے اور وہ ہے سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کا دربار پاک" ۳۴

تصنیف و تالیف

مولانا سید محمد نے تبلیغی دوروں میں کافی مصروفیت کے باوجود تصنیف و تالیف جیسا مشکل کام بھی انجام دیا ہے۔ سخت پابند مذہب ہونے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں مذہبی رنگ چھایا ہوا ہے اسی لئے افسانے اور کہانیوں کی طرف رجحان نہیں ہوا۔ انہوں نے ۱۹۲۲ء میں کچھوچھہ سے "ماہنامہ اشرفی" اردو زبان میں جاری کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو زبان میں تقریباً ۳۵ مدلل و مبسوط رسائل اور کتابیں لکھ کر شائع کیں اور ان کی بہت ساری مزید تصنیفات شائع نہ ہو سکیں۔ ان کی مطبوعہ تصانیف میں چند اہم تصانیف یہ ہیں:

(۱) ترجمہ قرآن مجید (اردو) مطبوعہ

(۲) حیات غوث العالم (سوانح سید اشرف جہانگیر سمنانی) مطبوعہ (اردو)

(۳) اتمام حجت، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۵ء (اردو)

(۴) تقوی القلوب، مطبوعہ کان پور ۱۹۲۵ء۔ (اردو)

(۵) قرآن مجید کی تفسیر (تین پارے اور چند رکوع کی تفسیر لکھی تھی کہ وفات ہو گئی))، (اردو)

(۶) فرش پر عرش (مجموعہ کلام، اردو) مطبوعہ

ان کی تصنیفات میں ترجمہ قرآن مجید (اردو) اور فرش پر عرش (مجموعہ کلام اردو) بہت اہم اور اردو ادبی خدمات میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

ترجمہ قرآن مسمّی بہ معارف القرآن:-

یہ ترجمہ قرآن مجید ان کئی اہم ترجموں میں اپنا ایک مقام حاصل کر چکا ہے جو کئی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ترجمہ کے علاوہ مولانا نے تفسیر قرآن بھی لکھی تھی مگر وہ مکمل نہ ہو سکی۔ مولانا سید محمد نے اپنی تفسیر میں شروع سے لے کر آخر تک اس بات کا خیال رکھا ہے کہ عام قاری اسے بآسانی پڑھ سکیں اس کی زبان صاف ستھری اور سادہ زبان ہے لیکن اسے وہ شہرت نہ حاصل ہو سکی جو ترجمہ قرآن مجید کی ہوئی۔

قرآن مجید کے مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ کئی علوم و فنون مثلاً، علم نحو، علم صرف، اصول تفسیر، علم فصاحت و بلاغت، اصول فقہ وغیرہ پر گہری نظر رکھتا ہو تب ہی اپنا فرض بخوبی نبھا سکے گا۔ مولانا سید محمد کی ان تمام علوم و فنون پر گہری نظر تھی اسی لئے ان کے تراجم قابل تحسین ہیں۔ مولانا نے ارشار باری کے مطابق اردو ادب کے اسلوب بیان میں فنی محاسن کے ساتھ بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ عربی زبان

ہیں جو اسلوب بیان قرآن حکیم کا ہے اردو زبان میں وہی اسلوب بیان انہوں نے بھی اختیار کی ہے ان کا یہ ترجمہ بامحاورہ اور شستہ زبان میں ہے۔ ان کے ترجمہ قرآن کے ابتدائی حصہ کو دیکھ کر مولانا احمد رضا بریلوی نے کہا "شہزادے! اردو میں قرآن لکھ رہے ہو۔" یہ ترجمہ شائع ہو چکا ہے ان کا یہ ترجمہ گجراتی، ہندی اور ٹیپن میں بھی ہے۔

اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ اس کے نیچے لکھا ہوا ہے جسے ہر اردو کا پڑھنے والا بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کیوں کہ ترجمہ کے الفاظ میں وہی ترتیب رکھی گئی ہے جو ترتیب الفاظ سورہ کی ہے اور ان کے ترجمہ میں ایک لفظ بھی زیادہ نہیں ہے یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ترجمہ میں مشہور لفظ "شروع کرتا ہوں" ترک کر دیا ہے تاکہ جس طرح قرآن مجید میں اس جملے کے متعلق کوئی لفظ نہیں ہے ترجمہ میں بھی نہ لایا جائے۔

اس ترجمہ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ترکیب نحوی جو عربی زبان میں اصل الفاظ سورہ کی ہے وہی اردو زبان میں برقرار رکھی گئی ہے۔ مثلاً ایاک نستعین کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے کہ تجھی سے ہم مدد چاہتے ہیں حالانکہ یہ "بک نستعین" کا ترجمہ ہے۔ ایاک نستعین میں مفعول بہ واقع ہے جار مجرور نہیں اس لیے مولانا سید محمد نے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ایاک نستعین کا یہ ترجمہ کیا ہے "ہم تیری ہی مدد چاہیں"۔ تاکہ اردو میں بھی مفعول بہ کی ضمیر مقدم رہ کر حصر کا فائدہ پہونچائے اور ترکیب میں ادبی تغیر کا بھی وہم نہ ہو۔ اس ترجمہ میں حتی الامکان عربی اور فارسی الفاظ سے اجتناب کیا گیا ہے اور آسان سے آسان ترین لفظ کو استعمال میں لایا گیا ہے مثلاً "یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروء" میں مولانا نے قروء کا ترجمہ بجائے حیض، ماہواری کے کیا ہے اسی طرح "انا ارسلناک شاھدا" میں شاہد کا ترجمہ بجائے حاضر ناظر کے "چشم دید

گواہ" اختیار کیا ہے اس کے علاوہ مثال کے طور پر چند آیتوں کے ترجمے پیش کئے جا رہے ہیں جن سے ان کی اردو ترجمہ نگاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید:- ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون (سورہ بقرہ) ترجمہ: "بیشک جنہوں نے جنم کا کفر کمایا یکساں ہے ان پر کیا ڈرایا تم نے انہیں یا نہ ڈرایا انہیں وہ ماننے والے ہی نہیں۔" اس ترجمہ میں خوبی بیان کے ساتھ اردو محاورہ کی پوری رعایت کی گئی ہے بطور مثال جب کسی کی کذب گوئی شہرت پا لیتی ہے تو اس کے بارے میں لوگ یہی کہتے ہیں کہ وہ جنم کا جھوٹا ہے، گویا وہ کبھی سچ بولا ہی نہیں اس آیت میں دراصل حکم ان لوگوں کے بارے میں ہے جو علم الٰہی میں ایمان سے محروم ہیں یہ ابو جہل، ابو لہب وغیرہ کفار کے حق میں نازل ہوئی۔

قرآن مجید:- ان اللہ علی کل شیء قدیر ۰ (سورہ بقرہ) ترجمہ: بیشک اللہ ہر چاہے پر قدرت والا ہے۔ اس ترجمہ میں ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے شئی کا معنی لے کر کذب وغیرہ اللہ کی طرف منسوب کیا۔ حالانکہ ان لوگوں نے شئی کا مفہوم ہی نہیں سمجھا یہاں پر "چاہے" سے شئی کا مفہوم واضح کر دیا گیا ہے کہ شئی اس کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ چاہے اور جسے نہ چاہے وہ شئی سے خارج ہے دوسرے لفظ میں شئی کا معنی جو تحت مشیت آسکے۔ تمام ممکنات شئی میں داخل ہیں کیوں کہ وہ تحت قدرت ہیں اور جو ممکن نہیں یعنی واجب یا ممتنع ہے اس سے قدرت و ارادہ متعلق نہیں ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات واجب ہیں اس لئے مقدور نہیں، اس ترجمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کذب اور تمام عیبیں محال ہیں اس قدرت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے مولانا جلال الدین سیوطی کی مشہور تصنیف "تفسیر جلالین (جلد اول)" میں شئی کی تفسیر شامل ہے جو اس ترجمہ کی مکمل تائید کر رہی ہے

کیوں کہ ثنا کے معنی میں چاہت کا معنی شامل ہے۔

قرآن مجید: قل هو الله احد (سورۂ اخلاص) ترجمہ: تم کہتے رہو، وہی اللہ ہی یکتا ہے، اس ترجمہ میں قل کا معنی تم کہتے رہو، دوام واستمرار کے طور پر ہے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ توحید میں کبھی بھی غفلت نہیں اختیار فرمائی۔

لہٰذا اس کے اندر رسول کے مقام و منصب کو مدنظر رکھتے ہوئے قل کا معنی تم کہتے رہو کیا گیا ہے تاکہ بعد میں کوئی یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ رسول نے اعلانِ توحید میں کبھی غفلت سے کام لیا ہے غالباً اسی کی رعایت کرتے ہوئے قل کا معنی دوام استمرار کے طور پر کیا گیا ہے۔ راقم السطور نے چند آیات کریمہ کے ترجمے معارف القرآن (مترجم مولانا سید محمد) سے نقل کر کے صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دیئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس سے کچھ نکات و معارف کی وضاحت بھی کر دی ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے۔ واقعی معارف القرآن اردو زبان میں بے مثل ترجمۂ قرآن ہے۔

شعر و ادب:-

مولانا سید محمد سید صاحب کو قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے دینی مسائل کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے بھی شغف تھا۔ سید صاحب ایک فطری شاعر تھے۔ لیکن آپ نے نعتیہ شاعری میں کمال پیدا کیا۔ نعت جیسے مشکل مرحلہ سے گزر کر انہوں نے عشق رسول کا ثبوت دیا ہے ان کا تمام نعتیہ کلام رنگ تغزل میں ڈوبا ہوا ہے اور اسی رنگ تغزل کو سید صاحب معراج شاعری سمجھتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

معراج شاعری ہے سید تغزل

سید صاحب ایک نازک خیال شاعر اور صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ ان کا دیوان "فرش پر عرش" دنیائے شعر و ادب میں اہمیت رکھتا ہے یہ دیوان ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جو ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کی شاعری میں کہیں اقبال کا رنگ، کہیں غالب و میر کی جھلک کہیں محسن کاکوروی کا اسلوب، نعت و منقبت سے خصوصی لگاؤ نظر آئے گا۔ غزل و نظم پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔

سید صاحب کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف انداز تغزل بھی برقرار رہتا ہے تو دوسری طرف متنوع مضامین کی رنگارنگی بھی نہیں جاتی۔ جن کا کسی نہ کسی طرح سے کوئی تعلق نعت رسول سے ہی ہوتا ہے۔ سید صاحب نے تصوف سے لے کر عشق و خودی تک کے مضامین پر طبع آزمائی کی ہے جو ان کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور نقوش کی طرف نشاندہی کرتے ہیں مگر خوبی کی بات یہ ہے کہ انداز اور لہجہ غزل کا ہی رہتا ہے مثلاً چند مضامین ایک ہی زمین کے تحت ملاحظہ کریں

خمریات ؎

ان مست نگاہوں نے وہ چیز پلائی ہے
جو تقویٰ کا تقویٰ ہے، مے نوشی کی مے نوشی

عشقیہ: ؎

تم شمع سے بھی سیکھو پروانوں سے بھی سیکھو
خاموشی میں گویائی، گویائی میں خاموشی

نعتیہ: ؎

محبوب کی فرقت میں یہ غم کی نشانی ہے
بے وجہ نہیں سید کعبہ کی سیاہ پوشی

[illegible] صاحب نے [illegible] مختلف [illegible] ہیں ۔

نظریہ حسن و عشق ۔

[illegible]

نظریہ [illegible] ۔

[illegible]

ذوق عمل ۔

[illegible]

نظریہ [illegible] ۔

جو باطل پہ [illegible] کو غم ناک کر دے
جو حق گوئی پہ مجبور کو بیباک کر دے

گناہوں کے دفتر کو جو پاک کر دے
اسی موت کو زندگانی کہوں گا

نظریہ زندگی و بندگی: ؎

درد سے جو بھری نہ ہو زندگی زندگی نہیں
حرص و ہوا خودی کی بندگی بندگی نہیں

حیات دوام کا نظریہ: ؎

مسیحا کی مسیحانہ داناؤں کے داماں میں
حیاتِ جاوداں کا راز ہے شمشیر عریاں میں

دنیا کی بے ثباتی: ؎

زندگی کا کوئی ثبات نہیں
ٹل گیا دن اگر تو رات نہیں

گردش صبح و شام: ؎

دن یاد رخ شہ میں گزرا پھر زلفوں میں دھیان رہا
یوں شام سے میری صبح ہوئی یوں صبح سے میں نے شام کیا

تاثیر چشم محبوبی: ؎

مرے نالے میں ہے نہ آہ میں ہے
جو اثر آپ کی نگاہ میں ہے

وہ مست اپنی نظر کا بنائے جاتے ہیں
پیئے ہوئے ہیں مجھے بھی پلائے جاتے ہیں

جلن کو دل کی رخ آتشیں سے بجھا کا کر
وہ آگ آگ کے اندر لگاتے جاتے ہیں

نعتیہ کلام کے علاوہ سید کے یہاں حمد خدائے تعالیٰ بھی جا بجا دکھائی دیتی ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ ان کا انداز بھی غزل کا ہے۔ علامہ اقبال کی وہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

"کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں"

ہے اس پر سید صاحب کا کلام اس طرح سے ہے ؎

کسی رنگ و بو کی نہ جستجو نہ کسی لباس کی آرزو
میرا ذوق سجدہ ہے اور تو کہ مجاز پھر بھی مجاز ہے
تیری ہر ادا میں ہے سوزشیں، تیری ہر ادا میں ہے سازشیں
میں نثار عشوۂ یار کے وہی سوز ہے وہی ساز ہے

یہ اشعار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سید صاحب نہ صرف اپنے موضوع سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں بلکہ فن کے تمام تقاضوں کے ساتھ بھی پورا انصاف برتا ہے اور فن کی تمام باریکیوں کا مکمل خیال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید شعرگوئی کے اس مسلک پر اصرار کرتے ہیں ؎

شعر کہنے کا اگر حق ہے تو اس کو سید
جو سخن گو سے سخن سنج و سخنداں ہو جاتے

دراصل ان کی شاعری کا یہی تابناک نظریۂ فن تھا جس سے ان کو شعرگوئی میں کمال حاصل ہوا۔ اختصار کے بارے میں سید کا کلام ملاحظہ ہو ؎

دل میں لہریں حسن کی بھر دیجیے
بند اک کوزے میں دریا کیجیے

مذکورہ بالا تمام اشعار سے یہ پتا چلتا ہے کہ سید کے الفاظ کی نشست و برخواست میں چستی و روانی اور برجستگی موجود ہے اور کلام میں مضمون آفرینی اور جدت طرازی، نازک خیالی اور بلند پروازی، فکر و معانی کی گہرائی و گیرائی، لطیف بذلہ سنجی اور جذبات و کیفیات کا پیچ و خم، تازگی اور شگفتگی، تغزل اور موسیقیت، موزونیت اور شیرینی سب کچھ موجود ہے اور سب سے بڑھ کر جو چیز شاعری کی لطافت سے بھی زیادہ اہم ہے وہ موضوع کے ساتھ خلوص بیکراں جو کلام کے بحر ذخار میں امواج مضطر کی طرح ہیں جن کے زیر و بم میں ایک خاص انداز ہے جو ان کی سب سے اہم خوبی کہی جاسکتی ہے خود کہتے ہیں ؎

آپ کی ہر غزل میں اے سید
ساز ہندی ہے لے حجازی ہے

مولانا کی شاعری میں صوفیانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے وہ عشق حقیقی میں اس طرح غرق ہیں کہ انہیں سب کچھ اسی میں نظر آتا ہے مثلاً ؎

در پیر مغاں میخانۂ عشق و محبت ہے
یہاں ہے زہد و تقوی آپ کا مے نوش ہو جانا

مولانا کا یہ شعر کتنا دلکش و دلفریب ہے ان کا یہ شعر حافظ شیرازی، مولانا روم اور عرفی وغیرہ کی یاد تازہ کر دیتا ہے پیر مغاں، مے خانہ، مے نوش وغیرہ کا استعمال اردو اور فارسی شاعری کی روایات رہی ہے سید نے اس روایت کو اپنی شاعری میں برقرار رکھا ہے جس کی مثال مذکورہ بالا شعر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں

جدت آفرینی، نکتہ بیانی، اچھوتہ پن، کنایہ، تشبیہ وغیرہ سب کچھ موجود ہے مثال کے طور پر ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

فلک پر کہکشاں صورت زمیں پر زر فشاں سیرت
سراپا نور ہیں گرد و غبار گنبد خضری

معراج کی کیفیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی پل میں فرش سے عرش تھے اس نازک احساس کو سید صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

ابھی [illegible] گئے تھے فرش سے تا عرش [illegible] سید
ابھی [illegible] آئے [illegible] [illegible] گنبد خضری

سید نے اپنی شاعری میں فارسی مصرعوں کا بھی استعمال کیا ہے جس میں ایک اردو مصرع ہے تو دوسرا فارسی مصرع مثلاً ؎

جس کا ہو گفتہ گفتۂ حق کون سی ہے خلق
بعد از رسول پاک کہ شد تاجدار خلق

یہ شعر قولِ باری تعالیٰ "وماینطق عن الھویٰ ان ھوالا وحی یوحی" کا ترجمان ہے یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات خدا کا قول ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جیسا اس خوبی کا مالک اور مخلوق کا تاجدار کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

اردو کی صوفیانہ شاعری میں خواجہ میر درد، آسی غازی پوری وغیرہ کے بعد سید صاحب نے مسائل تصوف کو بڑی خوش سلوبی سے قلمبند کیا ہے مثلاً ؎

نام ہی نام ہے کچھ ہے حقیقت کے سوا
راستہ کوئی نہیں ان کی شریعت کے سوا

کچھ نہیں ہے مری اس ہستیٔ بے بود کی بود
خواب غفلت کے سوا وہم کی علت کے سوا

سچ تو یہ ہے یہی سب کچھ ہے کہ کچھ بھی نہ رہے
طلب و طالب و مطلوب میں وحدت کے سوا

غیر ممکن ہے کہ ظاہر ہو مظاہر سے جدا
کثرت جلوہ نہیں جلوۂ وحدت کے سوا

بس فقط ولولۂ حب کا تماشا سمجھو
کیا حقیقت ہے مری اس کی مشیت کے سوا

مرحبا مستوی عرش الٰہی ہو کر
لا مکاں کون گیا ہے مرے حضرت کے سوا

سید نے ایک نظم تحریر کی ہے جس کا عنوان "ساغر مے" ہے جس میں وہ اپنے معشوق کا عکس دیکھتے ہیں وہ کہتے ہیں ؎

اتار لایا ہے شیشہ میں ان کو ساغر مے
شراب پیتے ہی دیکھا کہ ہے شراب میں یار

اس طرح کے بیشمار اشعار سید کے مجموعۂ کلام میں بھرے پڑے ہیں جن سے ان کی نازک مزاجی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی شاعری کی عظمت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ایک مشہور مترجم قرآن عالم اور مصنف ہی نہیں مایۂ ناز شاعر اور عاشق رسول نعت گو بھی تھے۔

(۷)

مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی

محمد نعیم الدین نام، تخلص نعیم، ۲۱ صفر ۱۳۰۰ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۸۳ء کو پیر کے دن مراد آباد میں پیدا ہوئے تاریخی نام غلام مصطفیٰ تھا اور ان کے والد مولانا محمد معین الدین نزہت تھے۔ آٹھ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوئے۔ اردو، فارسی والد ماجد سے پڑھی۔ ملا حسن تک درس نظامی حضرت مولانا شاہ فضل احمد سے حاصل کیا۔ مدرسہ امدادیہ میں مولانا سید گل محمد سے جو عظیم محدث تھے درس نظامی اور دورہ حدیث کی تکمیل کے بعد فتاویٰ نویسی سیکھی۔ طب مولانا شاہ فضل احمد امروہوی سے پڑھی۔ ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں دستار بندی ہوئی ان کے والد بزرگوار نے سنہ دستار بندی کے لیے یہ قطعہ تاریخ کہا ؎

ہے میرے پسر کو طلبہ پر وہ فضیلت
سیاروں میں رکھتا ہے جو مریخ فضیلت
نزہت نعیم الدین کو کہہ کے سنا دے
دستار فضیلت کی ہے تاریخ "فضیلت"

۱۳۲۰ھ

شاہ ابو احمد علی حسین اشرفی کچھوچھوی کے مرید ہوئے اور انہوں نے خلافت بھی دی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی بھی خاص نظر ان پر تھی انہوں نے بھی اپنا خلیفہ بنایا متعدد مواقع پر فاضل بریلوی نے اپنا وکیل مقرر کیا، تدریس میں خاص کمال اور نرالا

انداز تھا اپنی ان ہی خوبیوں کے تحت " استاذ العلماء " کے لقب سے نوازے گئے ۔ مولانا احمد رضا خان نے " صدر الافاضل " کا خطاب بھی عطا کیا ۔

مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی صائب الرائے ، مدبر اور مفکر تھے ملک کے حالات پر ان کی گہری نظر تھی آپسی جھگڑے مٹا کر انہوں نے اہل سنت کے مختلف طبقات میں اتحاد و اتفاق پیدا کر کے ایک دوسرے سے قریب کیا اور ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ ء میں بمقام بنارس آل انڈیا سنی کانفرنس کر کے ہندوستان کے پانچ سو مشائخ اور علماء کو ایک مرکز پر لا کر جمع کر دیا ۔

۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ ء کے آغاز ہی میں شدھی تحریک کا آغاز ہوا۔ ہندو سرمایہ داروں نے سوامی شردھانند کی مدد سے مسلمانوں کے خلاف زبردست تحریک چلائی جس کے جواب میں ابو البرکات سید احمد صاحب شیخ الحدیث و امیر دار العلوم حزب الاحناف لاہور نے مولانا نعیم الدین مراد آبادی کی نگرانی اور مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلوی کے تعاون سے اس فتنہ کے انسداد و استیصال کے لئے تبلیغی جماعت بنائی اس جماعت نے منظم طور پر شدھی فتنے کے سدباب کے لیے کام کیا اور اسلام کی تبلیغ کی ۔ مولانا نعیم الدین صاحب نے اسلام کی تبلیغ تقریر و تحریر کے ذریعہ کر کے مذہب اسلام کی گرانقدر خدمات انجام دیں ۔ انہوں نے اپنے رسالہ " السواد الاعظم " مراد آباد کے ہر شمارہ میں قسط وار شردھانند کے قرآن اور اسلام پر اعتراضات کے جوابات دیتے اور کھل کر لکھتے رہے نعیم الدین صاحب کی یہ تحریرات، اسلام اور قرآن پر غیر مسلموں کے اعتراضات کے مدلل جوابات کا ایک شاہکار ہیں ۔ السواد الاعظم کی کچھ فائلیں مولانا مبارک حسین صاحب مدیر ماہنامہ " اشرفیہ " مبارکپور ، ضلع اعظم گڑھ کے پاس ہیں۔

فتنہ شدھی کے سدباب کے لئے مولانا نعیم الدین صاحب نے شعبان ۱۳۴۳ھ

/ ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ مارچ ۱۹۲۵ء کو مراد آباد میں علماء و مشائخ اہل سنت کی ایک کانفرنس منعقد کی تھی جس میں مولانا سید ابو محمود احمد اشرف کچھوچھوی، مولانا سید سلیمان اشرف بہاری، مولانا یعقوب حسین صاحب بلاسپوری، مولانا عبدالمجید آنولوی، مفتی عبدالحفیظ خطیب آگرہ، مولانا سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری، مولانا محمد عمر صاحب نعیمی، مولانا حامد رضا خان بریلوی اور مولانا ابوالبرکات سید احمد نے شریک ہو کر اسلام کی حقانیت اور شردھانند کے اعتراضات کے جوابات کے موضوع پر تقریریں کیں اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ایک لائحہ عمل پیش کیا۔ اس تبلیغ کے سبب تقریباً ڈیڑھ لاکھ غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا مولانا برہمچاری جن کو ہندو دھرم پر عبور حاصل تھا کی تبلیغ سے تقریبا پچاس ہزار ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔

تصنیف و تالیف:-

مولانا نعیم الدین صاحب نے اردو تصانیف کے ذریعہ بڑا اہم رول ادا کیا وہ اعلیٰ درجہ کے خطیب، مدرس، مفسر، محدث اور مصنف و شاعر تھے۔ انہوں نے بیس سال کی عمر میں الکلمۃ العلیا لاعلاء علم المصطفیٰ تصنیف کی ان کی لکھی ہوئی ایک تصنیف تفسیر خزائن العرفان ہے اس تفسیر کے بارے میں پروفیسر عبدالقیوم لکھتے ہیں۔

> "آپ (مولانا سید محمد نعیم الدین) نے خزائن العرفان کے نام
> سے قرآن کریم کی عمدہ تفسیر لکھی ہے" [۳۵]

ڈیڑھ درجن سے زیادہ کتابیں اور رسائل انہوں نے تصنیف کیے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے

۱۔ درنایاب:-

یہ اردو زبان میں ہے اور ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مولانا نعیم الدین مراد آبادی کا ایک فتوی ہے جو قبر پر شاخ اور پھول ڈالنے اور اس سے میت کے تخفیف عذاب کی امید رکھنے کے شرعاً جواز کے بارے میں ایک استفتاء ہے اس رسالہ میں مولانا اور ان کے اس مسئلہ مذکور بالا میں مخالف مولوی حکیم ہدایت علی صاحب کے مابین مناظرہ کی ایک صورت پیش کی گئی ہے۔ نعیم الدین صاحب نے احادیث اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں بھر پور بحث کی ہے۔

۲۔ سواط العذاب علی قوامع القباب:-

یہ اردو زبان میں ہے سعودیہ عربیہ کے حکمران ابن سعود نے جب قبریں مسمار کرنا شروع کیا تھا تو پورے عالم اسلام میں کھل بلی مچ گئی تھی نعیم الدین صاحب نے بھی اس کے خلاف زور قلم کا استعمال کیا اور یہ رسالہ احادیث و فقہ کی روشنی میں لکھا ہے۔

۳۔ تحقیقات لدفع التلبیسات:-

دراصل محمد عبد الحمید خادم مدرسہ اسلامیہ رحمانیہ موضع رنگپور ڈاکخانہ جلال پور ضلع فیض آباد کے ایک استفتاء کا تحقیقی جواب ہے یہ استفتاء مولانا احمد رضا بریلوی سے متعلق ہے اس کی زبان اردو ہے۔

۴۔ الکلمۃ العلیا:- مطبوعہ حبیب المطابع دریا آباد۔ (اردو)

۵۔ تفسیر خزائن العرفان:۔ مطبوعہ (اردو)

۶۔ اطیب البیان رد تقویت الایمان:۔ مطبوعہ مرادآباد ۱۴۰۴ھ (اردو)

۷۔ کشف الحجاب:۔ مطبوعہ (اردو)

۸۔ کتاب العقائد:۔ مطبوعہ [illegible] سنبھل ۱۳۴۹ھ (اردو)

۹۔ زادالحرمین: مطبوعہ ناظم پریس، رام پور ۲۳ فروری ۱۹۷۱۔ (اردو)

۱۰۔ آداب الاخیار:۔ مطبوعہ (اردو)

۱۱۔ سیرت صحابہ:۔ مطبوعہ (اردو)

۱۲۔ سوانح کربلا:۔ مطبوعہ کانپور (اردو)

۱۳۔ احقاق حق:۔ مطبوعہ (اردو)

۱۴۔ گلبن غریب نواز:۔ مطبوعہ (اردو)

۱۵۔ ریاض نعیم:۔ مطبوعہ (اردو)

۱۶۔ افادات صدر الافاضل:۔ (مجموعہ فتاویٰ) (اردو)

۱۷۔ پراچین کال:۔ مطبوعہ (اردو)

۱۸۔ ارشاد الانام فی محفل مولود والقیام:۔ مطبوعہ (اردو)

تذکرہ علماء اہل سنت میں محمود احمد قادری نے لکھا ہے کہ مولانا نعیم الدین مرادآبادی کے مضامین الہلال والبلاغ (مدیر ابوالکلام آزاد) میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن بہت جستجو کے بعد بھی ان کے مضامین دستیاب نہیں ہوتے الہلال والبلاغ کے سارے پرچے دیکھے جو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ اس لئے محمود احمد قادری نے جو لکھا ہے وہ درست نہیں معلوم ہوتا۔

مولانا نعیم الدین مرادآبادی نے تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری میں بھی دلچسپی لی ہے چونکہ ان کو شاعرانہ ماحول ملا خود ان کے والد شاعر تھے وہ نزہت

تخلص رکھتے۔ عربی، فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کی ان کا مجموعہ کلام بھی شائع ہوا۔ جس سے ان کی ہشت پہلو طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ان کی گرانقدر علمی و ادبی خدمات کا بخوبی پتا چلتا ہے اس طرح انہوں نے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیتے ۶۷ برس کی عمر میں یعنی ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ کو ہم سے جدا ہو گئے۔ مولانا مفتی محمد ابراھیم نے ان کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ کہا ہے ؎

شوقِ نعیم ضد میں حضرت نعیم دیں
دار فنا سے دار بقا کو ہوئے رواں
رضواں نے دی ندا کہ فریدی سن وصال
کہہ دو ملا بہشت بریں میں انہیں مکاں

۱۳۶۷ھ

مولانا سید محمد نعیم الدین نعیم مرادآبادی کے حالات اور ادبی خدمات تشنہ معلوم ہوتے ہیں اس لئے یہاں دو مقالات کا اضافہ کیا جا رہا ہے، ایک پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد کا مطبوعہ مقالہ حالات و خدمات پر ہے اور دوسرا پروفیسر فاروق احمد صدیقی (بہار یونیورسٹی، بھارت) کا مقالہ جو شاعری پر ہے۔ ناشر

صدر الافاضل

مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی

(پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد)

صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ کی ولادت ۲۱ صفر المظفر ۱۳۰۰ھ (یکم جنوری ۱۸۸۳ء) کو مراد آباد (یو۔ پی۔ بھارت) میں ہوئی۔ ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۰ء میں مدرسہ امدادیہ (مرادآباد) سے دستار فضیلت حاصل کی۔ استاد گرامی مولانا شاہ محمد گل رحمۃ اللہ علیہ عارف کامل اور فاضل اجل تھے، فاضل ممدوح کے عشق و محبت اور علمیت و فقاہت کی ایک جھلک ان کی تالیف "ذخیرۃ العقبیٰ فی استحباب مجلس میلاد مصطفیٰ" (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) میں نظر آتی ہے۔۔۔۔ آپ کا سلسلہ حدیث براہ راست حجاز مقدس سے مربوط ہے، برصغیر پاک و ہند کے دوسرے سلاسل حدیث کے مقابلے میں آپ کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے۔۔۔۔

صدر الافاضل ایسے جلیل القدر استاذ کے تلمیذ رشید تھے، وہ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے بالخصوص فن حدیث اور علم التوقیت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ علم طب میں بھی مہارت حاصل تھی اور حکیم شاہ فضل احمد امروہوی سے شرف تلمذ تھا، شاعری میں اپنے والد ماجد استاذ الشعراء مولانا معین الدین نزہت سے فیض حاصل کیا اور نعیم تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا دیوان "ریاض نعیم" شائع ہو چکا ہے۔

صدر الافاضل حضرت شاہ محمد گل علیہ الرحمہ سے سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت تھے۔ بیعت کے بعد حضرت شاہ صاحب نے آپ کو حضرت شاہ علی حسین کچھوچھوی

رحمتہ اللہ علیہ (م۔ ۱۳۵۵ھ) کے سپرد کر دیا۔ صدر الافاضل نے آپ سے استفاضہ کیا اور آپ ہی سے خلافت و اجازت حاصل کی، آپ ہی کی اجازت سے فاضل بریلوی مولنا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ (م۔ ۱۹۲۱ء) سے بھی خلافت و اجازت حاصل کی۔ صدر الافاضل، فاضل بریلوی کے رازدار اور رمز شناس تھے، آپ نے ان کے مشن کو بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا اور مسلمانانِ ہند کی سیاسی اور مذہبی امور میں رہنمائی فرمائی۔

۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں مراد آباد میں آپ نے مدرسہ انجمن اہل سنت و جماعت کی بنیاد رکھی بعد میں ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء میں اس مدرسہ کا نام جامعہ نعیمیہ قرار پایا۔ اس جامعہ کے فیض یافتہ اور صدر الافاضل کے تلامذہ پاک و ہند میں بہت سے جامعات کے بانی، بہت سی کتابوں کے مصنف اور بہت سے رسالوں کے مدیر ہیں مثلاً یہ حضرات:۔

۱۔ مولانا مفتی محمد عمر نعیمی علیہ الرحمہ (بانی مدرسہ بحر العلوم مخزن عربیہ، کراچی) آج کل یہ مدرسہ دار العلوم نعیمیہ کے نام سے ایک ٹرسٹ کے زیر انتظام چل رہا ہے۔

۲۔ علامہ ابو الحسنات مولنا محمد احمد قادری علیہ الرحمہ۔۔۔ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے وقت اجلاس لاہور میں موجود تھے۔ ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس (بنارس) میں شرکت کی۔ ۱۹۴۸ء میں تحریک آزادی۔ کشمیر میں حصہ لیا۔ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت میں سرگرمی سے جدو جہد کی جمعیتہ العلماء پاکستان کے پہلے صدر تھے آپ کی تصانیف میں یہ قابل ذکر ہیں:۔

تفسیر الحسنات (چھ جلدیں)، ترجمہ کشف المحجوب، شمیم رسالت، شرح قصیدہ بردہ شریف، اوراق غم، صبح نور، قراطیس المواعظ، فرشتہ رحمت، اظہار الاسقام، مظہر الاسرار، التبیان، مونس الاطباء وغیرہ وغیرہ

۳۔ ابوالبرکات مولانا سید احمد قادری (ناظم مرکزی مدرسہ انجمن حزب الاحناف لاہور) آپ ہی کے صاحبزادے علامہ محمود احمد رضوی بخاری شریف کے شارح اور ماہنامہ رضوان (لاہور) کے مدیر ہیں۔

۴۔ ابوالخیر مولانا مفتی محمد نور اللہ صاحب (بانی مدرسہ [illegible] حنفیہ بصیر پور، ساہیوال) آپ فتاویٰ نوریہ کے مصنف ہیں۔ آپ ہی کی سرپرستی میں یہاں سے ماہنامہ "نور الحبیب" نکل رہا ہے۔

۵۔ علامہ پیر محمد کرم شاہ صاحب (دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف) آپ کی تفسیر ضیاء القرآن شہرت عام حاصل کر چکی ہے، آپ کی سرپرستی اور ادارت میں پنجاب کا منفرد علمی اور مذہبی مجلہ "ضیائے حرم" بڑی کامیابی سے نکل رہا ہے۔

۶۔ مولانا مفتی محمد حسین نعیمی (بانی جامعہ نعیمیہ، لاہور) آپ کی سرپرستی و ادارت میں ماہنامہ "عرفات" نکل رہا ہے

۷۔ مولانا مفتی احمد یار خاں علیہ الرحمہ، آپ کی تالیف تفسیر نعیمی مقبول و معروف ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل تصانیف آپ سے یادگار ہیں۔

علم المیراث، جاء الحق، شان حبیب الرحمٰن، سلطنت مصطفےٰ، دیوانِ سالک، علم القرآن، اسرار الاحکام، مرآۃ شرح مشکوٰۃ شریف (آٹھ جلدوں میں)،

نعیم الباری فی شرح البخاری، نور العرفان فی حاشیۃ القرآن، مواعظ نعیمیہ، فتاوی نعیمیہ، اسلامی زندگی وغیرہ۔

راقم الحروف ایام نو عمری میں صدر الافاضل کی زیارت سے مشرف ہوا ہے اور ان کی تقاریر سنی ہیں۔ صدر الافاضل ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء سے بہت قبل مسجد جامع فتحپوری، دہلی کی محفل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ۱۲ ربیع الاول کی شب کو ہر سال تقریر فرماتے تھے، پھر ۱۲ ربیع الاول کو بعد نماز ظہر بھی تقریر فرماتے تھے۔ اس محفل پاک کے بانی راقم کے والد ماجد حضرت مفتی اعظم ہند شاہ محمد مظہر اللہ رحمۃ اللہ علیہ (م۔ ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء) تھے۔ صدر الافاضل اور آپ کے درمیان نہایت ہی مخلصانہ تعلقات تھے۔ بارھویں شب مبارک کو محفل میلاد میں شرکت فرمانا ہی اس خصوصی تعلق و محبت کی نشاندہی کرتا ہے۔

صدر الافاضل تبلیغ اسلام اور ناموس مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت و حمایت میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ اس سلسلے میں آپ نے عیسائیوں اور آریوں سے کامیاب مناظرے فرمائے۔ آپ نے اپنے رسالہ السواد الاعظم میں بھی ان لوگوں کا رد کیا، مثلاً پنڈت دیانند سرسوتی کی کتاب ستیارتھ پرکاش کے اسلام اور شارع اسلام پر اعتراضات کے مسکت و مدلل جواب دیے۔ مگر تحریر و تقریر میں کسی مقام پر تہذیب و شائستگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا، اس جذباتی دور میں یہ خوبی نہایت ہی قابل تحسین ہے۔۔۔ آپ نے تبلیغ اسلام کے لئے الموڑہ، نینی تال، ہلدوانی وغیرہ کے پہاڑی علاقوں کا دورہ کیا، تبلیغ اسلام کے لئے وہاں قیام فرمایا اور ایک رسالہ "پراچین کال" تحریر فرمایا جو غالباً پہاڑی زبان میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ہی ہے۔۔۔ اشاعت اسلام کے لئے آپ نے پھیری والوں کے روپ میں اپنے گماشتے بھیجے جنہوں نے گھر گھر جاکر اسلام کو پھیلایا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ علماء

بالعموم تبلیغ اسلام سے بے توجہ تھے۔ بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی باتیں کر رہے تھے۔

۱۹۱۹ء / ۱۳۳۸ھ اور ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت، تحریک ترک موالات کے جذباتی دور میں آپ نے تحریر و تقریر کے ذریعہ مسلمانوں تک اسلام کے سچے پیغام کو پہنچایا اور صدر جمعیۃ علماء ہند کو ہندو مسلم اتحاد کے خطرات سے آگاہ کر کے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے سے روکا۔۔۔۔ پھر دہلی جاکر مولانا محمد علی جوہر کو سمجھایا بالآخر وہ ہندو مسلم اتحاد کی دعوت سے دست بردار ہو کر تائب ہو گئے۔ مولانا محمد اطہر نعیمی اپنے والد ماجد تاج العلماء سے اور وہ صدر الافاضل سے روایت کرتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن جانے سے قبل مولانا محمد علی جوہر صدر الافاضل سے ملنے آئے، صدر الافاضل نے پھر ہندو مسلم اتحاد کے نتائج و عواقب کی طرف ان کو متوجہ کیا، اس پر انہوں نے فرمایا:-

"اگر زندہ رہا تو اس کی تلافی کی کوشش کروں گا"۔

مولانا شوکت علی خود مراد آباد جاکر صدر الافاضل کے دولت کدے پر حاضر ہوتے اور ان کے سامنے ہندو مسلم اتحاد کی حمایت و تائید سے دست کش ہوتے۔۔۔۔ دونوں بھائیوں کو ہندوؤں کی بیوفائی کا شدید احساس تھا۔

گورگوکل کی تحریک چلائی گئی تو صدر الافاضل نے اس کے مقابلے کے لئے اعاظم و اکابر اہل سنت کو مراد آباد جمع کیا۔ جہاں ۱۹۲۵ء / ۱۳۴۴ھ میں آل انڈیا سنی کانفرنس (الجمعیة العالیة المرکزیة) کی بنیاد رکھی گئی جس کے ناظم اعلیٰ صدر الافاضل منتخب ہوئے اور مستقل صدر حضرت محدث علی پوری، پیر سید جماعت علی شاہ علیہ الرحمہ (م ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء)۔

۱۹۲۴ء / ۱۳۴۳ھ اور ۱۹۲۵ء / ۱۳۴۴ھ کے درمیان شدھی کی تحریک

چلی تو اس کی مدافعت کے لئے صدر الافاضل نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ بریلی میں جماعت رضائے مصطفےٰ قائم کی گئی۔ جس کے تحت اس فتنہ ارتداد کا مقابلہ کیا گیا، صدر الافاضل نے آگرے کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور بالآخر شردھانند کے اس فتنے کا خاتمہ ہوگیا۔

۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۸ء میں مراد آباد سے ماہنامہ "السواد الاعظم" جاری کیا اور اس کے ذریعہ مذہبی اور سیاسی میدانوں میں مسلمانانِ ہند کی رہنمائی فرمائی، اس شعر سے آپ کے عزم و حوصلہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

پھر جنوں کہتا ہے خود کو پابہ جولاں دیکھیے
چلیے اٹھیے، اب کے پھر وحشت میں زنداں دیکھیے
نعیم

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس (لندن) میں جب علامہ اقبال نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی تو آپ نے اس کی پرزور تائید کی اور اس تجویز کے مخالف ہندو اخبارات و رسائل کا خوب تعاقب فرمایا اور اپنے موقف کی حمایت میں نہایت معقول اور دل نشیں دلائل پیش کئے۔۔۔۔ ۱۹۴۰ء / ۱۳۵۹ھ جب لاہور میں "قرارداد پاکستان" منظور ہوئی تو اس موقع پر آپ کے تلمیذ رشید مولانا ابو الحسنات محمد احمد علیہ الرحمہ موجود تھے اور جلسہ کے سرگرم کارکن تھے۔ ۱۹۴۶ء میں نواب محمد اسماعیل خاں (صدر۔ یو۔ پی مسلم لیگ) کے ذریعہ قائداعظم کو تار دلوایا کہ جب تک حکومت برطانیہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی علاقہ کے درمیان ایک بین الاقوامی آزاد علاقہ تسلیم نہ کرلے، تقسیم کی تجویز منظور نہ کریں۔

۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۶ء میں صدر الافاضل ہی کی کوششوں سے بنارس (بھارت) میں آل انڈیا سنی کانفرنس کے چار روزہ تاریخی اجلاس ہوئے (یعنی ۲۷ اپریل تا ۳۰ اپریل)۔۔۔۔ اس کانفرنس میں پاک و ہند کے دو ہزار علماء و مشائخ اور ۶۰ ہزار

دوسرے حاضرین شریک تھے۔ "قرارداد پاکستان" کی حمایت میں جو تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ اس کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔

> "آل انڈیا سنی کانفرنس کا یہ اجلاس مطالبہ پاکستان کی پر زور حمایت کرتا ہے۔"

(خطبہ صدارت جمہوریت اسلامیہ، مطبوعہ (مراد آباد) ۱۹۴۶ء، ص ۲۹)

مطالبہ پاکستان کی حمایت و اشاعت کے لئے صدر الافاضل نے ہندوستان اور پاکستان کے دور دراز علاقوں کا دورہ کیا، حتّٰی کہ مراد آباد سے بنگال تک تشریف لے گئے اور وہاں مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی جو آگے چل کر مشرقی پاکستان کی تعمیر و تشکیل میں معین و مددگار ثابت ہوئی۔

آل انڈیا سنی کانفرنس کے مذکورہ بالا اجلاس کے بارے میں حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء) کے تاثرات قابل توجہ ہیں ---- مولانائے موصوف کی ذات تحریک آزادی ہند میں بڑی اہمیت کی حامل ہے ---- آپ تحریک خلافت میں علی برادران کے ساتھ رہے ---- تحریک شدھی میں اس کی سخت مزاحمت کی ---- بنگال میں مولوی حسین احمد کے مقابلے میں مسلم لیگ کے نمائندے کو کامیاب کرایا ---- ۲۳، مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس میں قائد اعظم کے سامنے قرارداد پاکستان کی حمایت میں پرزور تقریر فرمائی ---- ۱۹۴۵ء میں والیٔ دکن اور قائد اعظم کی ملاقات کے لئے راہ ہموار کی، ---- ۱۹۴۶ء میں علماء کا وفد حجاز لے گئے اور حکومت سعودیہ کو پاکستان کی حمایت پر آمادہ کیا ---- الغرض انہوں نے تنہا وہ خدمات انجام دیں جو ایک جماعت کے بس کی نہ تھیں ---- ایسا مجاہد جب کوئی بات کہے تو وہ بات معمولی نہیں، بہت وزنی ہے ---- آل انڈیا سنی کانفرنس (۱۹۴۶ء) کے بارے میں آپ فرماتے ہیں۔

> "میں نے اپنی چوالیس سالہ قومیات کی زندگی میں صدہا کانفرنسیں دیکھیں اور بیسیوں خود منعقد کیں لیکن میں کہتا ہوں کہ بنارس کی سنی کانفرنس کی طرح گزشتہ چالیس سالوں میں کوئی کانفرنس بھی نہ ہو سکی۔"

(غلام معین الدین! حیات صدر الافاضل، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۰)

پاکستان معرض وجود میں آنے کے بعد صدر الافاضل لاہور اور پھر کراچی تشریف لائے، دستوری خاکہ کے لیے آپ سے عرض کیا گیا لیکن اچانک طبیعت ناساز ہو گئی اور واپس ہندوستان تشریف لے گئے اور پھر وہاں ممالک اسلامیہ اور خلافت عثمانیہ کے دساتیر و قوانین کو سامنے رکھ کر پاکستان کے لیے ایک اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنا شروع کیا، ابھی ۱۱ دفعات لکھنے پائے تھے کہ ۱۹، ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ (۲۲، اکتوبر ۱۹۴۸ء) کو مراد آباد میں وصال فرما گئے۔ مزار مبارک جامعہ نعیمیہ (مراد آباد) کے احاطہ میں واقع ہے۔

صدر الافاضل کی اولاد امجاد میں چار فرزند ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) مولوی ظفر الدین (۲) مولوی محمد اختصاص الدین، (۳) جناب ظہیر الدین (۴) جناب اظہار الدین

السواد الاعظم کے مطالعہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ ۲۱، و ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء کو طاعون کی وبا میں یکے بعد دیگے دو صاحبزادیاں فوت ہو گئیں۔ اس وقت صدر الافاضل علی پور تشریف رکھتے تھے اور تدفین کے بعد دولت کدے پہنچے اس لئے یہ غم معمولی غم نہ ہو گا۔ دو صاحبزادیاں اور تھیں۔ ایک زوجہ مولوی حکیم سید یعقوب علی (مقیم کراچی) اور دوسری زوجہ حافظ سید حامد علی (مقیم مراد آباد)

صدر الافاضل متبحر عالم اور صاحب بصیرت سیاستداں تھے۔ علمیت کا اندازہ اس

ت ہوتا ہے کہ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے الطاری الداری کا مسودہ آپ کو دکھایا۔ اور جب آپ نے بعض ترمیمات کی سفارش کی تو قبول کر لی گئیں ...۔

آپ نے بیس سال کی عمر میں الکلمۃ العلیا لاعلاء علم المصطفٰے تصنیف فرمائی۔ ڈیڑھ درجن سے زیادہ کتب و رسائل آپ سے یادگار ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:-

تفسیر خزائن العرفان، اطیب البیان، مجموعہ فتاوی، تبرکات صدر الافاضل، سوانح کربلا، کتاب العقائد، ابتدائی، اسواط العذاب، آداب الاخیار، فرائد النور، کشف الحجاب، التحقیقات لدفع التلبیسات، زاد الحرمین، ریاض نعیم، گلبن غریب نواز، پراچین کال، احقاق حق، ارشاد الانام فی محفل المولود والقیام وغیرہ وغیرہ

صدر الافاضل کی تصانیف مراد آباد سے بھی شائع ہوئیں اور ادارہ نعیمیہ رضویہ لاہور، ازہر بک ڈپو (کراچی)، مکتبہ اہل سنت (کراچی)، نوری کتب خانہ لاہور، اور مکتبہ فریدیہ کراچی نے بھی بعض کتابیں شائع کی ہیں۔

الغرض صدر الافاضل چودھویں صدی ہجری کے ایک جلیل القدر عالم اور ماہر سیاست داں تھے، مذہب و سیاست پر ان کی بہت گہری نظر تھی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شائع ہونے والی تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند میں پروفیسر عبدالقیوم نے بجا طور پر صدر الافاضل کے لئے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے۔:-

> مولوی سید نعیم الدین مراد آبادی ایک جلیل القدر عالم دین اور نامور فاضل تھے اور ہزاروں لوگ آپ کے فیض سے بہرہ ور ہوئے، آپ نے خزائن العرفان کے نام سے قرآن کریم کی ایک عمدہ تفسیر لکھی ہے۔ (جلد دوم۔ ص ۴۲۳)

مآخذ و مراجع

احمد رضا خان: الاستمداد، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۹۱

اقبال احمد فاروقی: حواشی الاستمداد، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۶ء ص ۹۱، ۹۲

سید محمد محدث کچھوچھوی: خطبہ صدارت جمہوریت اسلامیہ، مطبوعہ بریلی ۱۹۴۶ء ص ۲۹

سید محمد جیلانی: المیزان، امام احمد رضا نمبر، مطبوعہ بمبئی ۱۹۷۶ء ص ۱۸۸

عبدالقیوم پروفیسر: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء ص ۴۲۳

غلام معین الدین نعیمی: حیات صدر الافاضل، مطبوعہ لاہور

محمد صادق قصوری: اکابر تحریک پاکستان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۲۶۶ تا ۲۷۴

محمد عبدالحکیم شرف قادری: تذکرہ اکابر اہل سنت، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۶ء

محمد مسعود احمد: فاضل بریلوی اور ترک موالات، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء ص ۷۷ تا ۸۰

محمد مسعود احمد: مقالہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) جلد دہم جز پنجم

محمد نعیم الدین مرادآبادی: کتاب العقائد، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۳ء

محمد نعیم الدین مرادآبادی: سوانح کربلا، مطبوعہ کراچی

محمود احمد قادری: تذکرہ علمائے اہل سنت، مطبوعہ کانپور، ص ۲۵۳

السواد الاعظم (مراد آباد): ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء۔ ص ۹ تا ۵۶
السواد الاعظم (مراد آباد): ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء۔
السواد الاعظم (مراد آباد): صفر المظفر ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء۔
السواد الاعظم (مراد آباد): رمضان و شوال ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴۔۵ء، ص ۱۳
الہام (بہاولپور): ۲۱، نومبر ۱۹۷۶ء۔ ص ۵، ۶

نوٹ:- بعض معلومات مندرجہ ذیل علماء سے حاصل کیں

۱۔ مولانا غلام محی الدین فریدی نعیمی (ابن حکیم غلام احمد فریدی خلیفہ فاضل بریلوی و برادر عم زاد صدر الافاضل)

۲۔ مولانا محمد اطہر نعیمی (ابن مفتی محمد عمر نعیمی تلمیذ رشید صدر الافاضل و مہتمم جامعہ نعیمیہ، مراد آباد)

صدرُ الافاضل "ریاضِ نعیم" میں

پروفیسر فاروق احمد صدیقی (بہار یونیورسٹی)

حضرت صدر الافاضل کی جامع اوصاف و حامل کمالات شخصیت، علمائے اہل سنت و جماعت کی زریں تاریخ میں بے حد ممتاز و محترم ہے۔ ایک عالم متبحر، استاذ اجل، مفسرِ قرآن، محدث کبیر، مناظر بے عدیل اور اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کے معتمد وکیل تھے۔ آپ کی شخصیت شَشْ جہت، بہر رخ کامیاب و بے مثال ہے۔ انھوں نے جس میدان میں قدم رکھا اپنی عظمت و انفرادیت کا پرچم لہرا دیا۔ اور جس موضوع پر لکھا فکر و تدبر کی گہری چھاپ چھوڑی۔

ان کی تقریباً ایک درجن تصنیفات اور مختلف تنظیمی و تحریکی سرگرمیاں اس امر کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ وہ ایک شخص نہیں مستقل ادارہ تھے۔ اس لئے ان کے گوناگوں کارناموں کا احاطہ کرنے کے لئے واقعی ایک مستقل ادارہ کی ضرورت ہے۔

میں نے ابھی ابھی صدر الافاضل کی چند امتیازی خصوصیات کی طرف اشارے کئے ہیں۔ ان کی ایک اور اہم خصوصیت جو عام نگاہوں سے اوجھل ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک خوش فکر و خوش کلام شاعر بھی تھے۔ میں اس وقت اس سے متعلق اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ محتاج وضاحت نہیں کہ آپ کو شعری ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا سید معین الدین نزہت بڑے پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اپنے عہد کے استاذ شاعروں میں ان کا شمار تھا۔ یہاں بطورِ نمونہ میں ان کے وہ دو اشعار نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جو ایک مخصوص پس منظر میں کہے گئے ہیں۔ وہ یہ کہ آپ ابتداً مولوی قاسم نانوتوی کے مرید تھے۔ جب آپ کو ان کی بد عقیدگی سے مطلع

کیا گیا تو آپ نے فوراً نسخ بیعت کر کے رجوع کیا اور یہ اشعار کہے ؎

پھرا ہوں اس کی گلی سے نزہت ہوں جس میں گمراہ شیخ و قاضی
رضائے احمد اسی میں سمجھوں کہ مجھ سے احمد رضا ہوں راضی

اس شعر کا مصرعہ ثانی جو دعوتِ پیغام دے رہا ہے آج بھی اس کی اہمیت و صداقت مسلم ہے۔ خوش عقیدہ مسلمان کا یہی وظیفہ و ترانہ ہونا چاہئے کہ ؎

رضائے احمد اسی میں سمجھوں کہ مجھ سے احمد رضا ہوں راضی

خیر یہ گفتگو بطور جملہ معترضہ آگئی تھی۔ جہاں تک صدر الافاضل کی شاعرانہ دلچسپیوں اور کارگزاریوں کا تعلق ہے تو یہ بات بلا توقف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کی حیثیت ان کے دیگر کارناموں کے تقابل میں ضمنی اور ثانوی تھا۔ ان کی زندگیِ پاک کا اصل مقصد مشن محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالت کا پرچم بلند کرنا اور ان کے گستاخوں کی سرکوبی کرنا تھا۔۔۔۔ اس لئے وہ تصنیفی و تحریکی سرگرمیوں میں زیادہ مصروف و منہمک رہے۔ اور شعر گوئی کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ "ریاض نعیم" میں شامل ان کا کلام جو مختلف اصناف و موضوعات پر ہے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ اگر آپ نے تھوڑی سی توجہ اور فرمائی ہوتی تو آپ کی شاعرانہ عظمت کا کچھ اور ہی عالم ہوتا۔

"ریاضِ نعیم" مرتبہ حضرت مولانا معین الدین نعیمی ایک ایسا حسین شعری گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ و بو کے پھول موجود ہیں، حمد، نعت، منقبت، غزل اور مناجات وغیرہ۔ بظاہر یہ بہت مختصر شعری مجموعہ ہے جس میں صرف ایک حمد، ۱۷ نعتیں (۱۵ اردو اور ۲ فارسی)، ۳ منقبت (۲ اردو ایک فارسی)، ۱۴ غزلیں (۱۲ اردو، ۲ فارسی)، ایک قطع اور کچھ مخمس اور تضمین ہیں لیکن یہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کا حامل ہے۔

مجموعہ کا آغاز خدائے پاک کی حمد سے ہوتا ہے۔ اس میں حضرت صدر الافاضل نے خدائے قدیر کی عظمت و تقدیس بیان کرتے ہوئے اس کی تمام صفتوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک ایک لفظ سے کمالِ عبودیت اور انکساری کا اظہار ہوتا ہے۔ پیرایہ زبان میں بڑی پاکیزگی، طہارت اور نفاست ہے۔ عربی و فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرنے کی بجائے روزمرہ کی ٹکسالی زبان استعمال کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہندی کے آسان عام فہم اور خوبصورت الفاظ بھی آپ نے بڑی چابکدستی سے موتی کی طرح پروئے ہیں۔ اسلئے سادگیِ زبان اور پاکیزگیِ بیان دونوں کا حسین امتزاج یہاں نظر آتا ہے۔ ردیف میں میرا مولیٰ کی تکرار حرفِ میم پاک کی حلاوت و شیرینی سے زبان کو طراوت بخشتی ہے۔ مثلاً حسبِ ذیل تین اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سب کا پیدا کرنے والا میرا مولیٰ میرا مولے
سب سے افضل سب سے اعلیٰ میرا مولیٰ میرا مولے

جگ کا خالق، سب کا مالک، وہی باقی باقی مالک
سچا مالک، سچا آقا میرا مولیٰ میرا مولے

رازق، داتا پالن ہارا میرا مولیٰ میرا مولے

جہاں تک ان کی نعتیہ شاعری کا تعلق ہے وہ عشق و وارفتگی کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے جو ہماری مسرت و بصیرت میں خوبصورت اضافے کرتا ہے اس میں خلوص کی خوشبو بھی ہے اور عقیدت کی روشنی بھی ایمان کی لذت و حلاوت بھی ہے اور بیان کی نفاست و پاکیزگی بھی یعنی ایک حیات آفریں اور روح پرور فضا نے ان کی نعتوں کو دلکشی و رعنائی کا مرقع بنا دیا ہے۔ انھوں نے نعتیہ شاعری برائے شاعری نہیں کی

ہے بلکہ جذبۂ بے اختیار شوق کے تحت کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہر جگہ از دل خیزد بر دل ریزد کی کیفیت نظر آتی ہے مثال کے طور پر ان کی ایک نعت کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شبِ غم بھی آخر بسر ہو گئی
تڑپتے تڑپتے سحر ہو گئی

مرے درد دل کی خبر ہو گئی
جو چشمِ رحمت [illegible] ہو گئی

مدینہ کا دیدار مشکل نہیں
نگاہِ عنایت اگر ہو گئی

دیار نبی میں قضا ہو گئی
یہ تقدیر کس [illegible] ہو گئی

مواجہ میں عرض صلوٰۃ و سلام
مری آبرو اس قدر ہو گئی

ان اشعار میں عقیدت کی فراوانی تو ہے ہی آسان اور سادہ الفاظ نے حد درجہ دلکشی پیدا کر دی ہے۔ الفاظ و خیالات میں اک سیل سبک کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اسلوب میں روانی، برجستگی اور حیرت انگیز تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ پوری نعت بحر متقارب میں کہی گئی ہے جس سے اس کی نغمگی و ترنم دوبالا ہے۔

نعتیہ شاعری کا ایک اہم موضوع حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ پاک کی زیارت کی آرزو اور اشتیاق ہے میرے خیال میں کوئی ایسا مداحِ رسول نہیں جس نے اس نفیس موضوع پر ایک دو اشعار نہیں کہے ہوں، حضرت صدر الافاضل جیسا عاشقِ رسول بھلا کیسے اس موضوع پر قلم نہ اٹھاتا، دیکھیے ایک عاشق صادق زیارتِ محبوب

کے لئے کس طرح مچل رہا ہے ؎

چہرۂ پاک سے نقاب آپ ذرا اٹھائیں تو
حسن خدا نما کی شان، شان خدا دکھائیں تو
کشتۂ عشق سیدی آپ کے نام پر مرے
جلوہ انہیں دکھایئے آپ اگر جلائیں تو
کرنے کو جان و دل فدا روضۂ پاک پر شہا
پہنچے نعیم بے نوا آپ اگر بلائیں تو

طلبِ صادق تھی اس لئے واقعی آقائے دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے نعیم کو اپنے روضۂ پاک پر بلا کر ان کی شفاعت اپنے ذمے کر لی ع

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

قرآن و حدیث سے ہمیں جو عقیدہ ملا ہے اس کے مطابق حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہمارے اور ساری کائنات کے ملجا و ماویٰ ہیں۔ وہی جان ایمان اور مدارِ نجات ہیں۔ ان کے آستانۂ کرم سے دور رہنے والے کے لئے نہ کہیں مفر ہے نہ مقر، اس لئے حضرت صدر الافاضل ایمان و عقیدت کی توانائی کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

درد و الم کے مبتلا جن کی کہیں نہ ہو دوا
دیکھیں وہ شانِ کبریا آپ کے در پہ آئیں تو
بد ہیں اگرچہ ہم حضور آپ کے ہیں مگر ضرور
سامنے کس کے سر جھکائیں آپ ہمیں بتائیں تو

آخری شعر کے دوسرے مصرعہ میں "آپ ہمیں بتائیں تو" لب و لہجہ کی شائستگی و شستگی برجستگی و اثر آفرینی پر دال ہے، یقین کی کیفیت عقیدت کی پختگی عشقِ کا والہانہ پن اور اظہار کی بے ساختگی نمایاں ہے۔ عشقِ صادق کا ایک تقاضہ

یہ ہے کہ محبوب کے ساتھ اس کی منزل و قیام گاہ در و دیوار، گنبد و مینار، گلی کوچے بلکہ اسکے ذرے ذرے سے عقیدت و محبت آشکارا ہو، ایک عربی شاعر کہتا ہے

فی مذهبی حب الدیار لا هلها
و للناس مِمّا یعشقون مذاهب

(ترجمہ: میرے مذہب میں دیار سے محبت کرنا صاحبِ دیار کی وجہ سے ہے اور عشق میں لوگوں کے الگ الگ مذہب ہوا کرتے ہیں)

چنانچہ حضرت صدر الافاضل نے جلوہ گاہ محبوب مدینہ طیبہ اس کے اطراف و اکناف صحرا و گلزار اور خاک و ذرات سے بھی گہری عقیدت کا اظہار فرمایا ہے، وہ اس ارض مقدس کی ہواؤں کو صحت بخش ہی نہیں زندگی بخش قرار دیتے ہیں۔ وہاں کے چمن کی بہار تو جانِ بہار ہے، صحرائے مدینہ کی ہواؤں میں اتنی قوتِ نمو و تاثیر ہے کہ اس سے دل کی مرجھائی ہوئی کلیاں مسکرا اٹھتی ہیں کس سرشاری و وارفتگی سے فرماتے ہیں ؎

اے بہارِ زندگی بخش مدینہ مرحبا
اے فضائے جانفزائے باغِ طیبہ مرحبا
غنچۂ پژمردۂ دل کو شگفتہ کر دیا
مرحبا اے بادِ صحرائے مدینہ مرحبا
سرمۂ نور بصر ہو آکے میری آنکھ میں
مرحبا صد مرحبا اے خاکِ بطحا مرحبا

ایمان تو یہ ہے کہ جس طرح ذکرِ الٰہی سے دلوں کو اطمینان اور چین نصیب ہوتا ہے اسی طرح یادِ مصطفےٰ بھی ایسی روح افزا ہوتی ہے کہ عاشقِ صادق سانس لیتا ہے تو جنت

کی ہوا آتی ہے اور قلب فرحت انبساط سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے صدر الافاضل نے کیا خوب کہا ہے ؎

کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہو تمہارا نام لینے سے
محمد مصطفٰے تم ہو، حبیب دو جہاں تم ہو

حضرت صدر الافاضل کی نعتوں میں ایک واضح فکری عنصر یہ نظر آتا ہے کہ آپ عالم اسلام کے آلام واضطراب اور باہمی نفاق وانتشار کو دیکھ کر حد درجہ دل شکستہ اور محزون ہیں۔ مسلمانوں کی گرتی ہوئی ساکھ اور ان کا وقار مجروح دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور خاص طور پر اخوتِ اسلامی کا پیرہن تار تار دیکھ کر وہ بے حد مضطرب ہیں۔ چنانچہ بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں یوں استغاثہ فرماتے ہیں ؎

اب کیجئے ایسا کرم، ہو دین کا اونچا علم
کفار کی گردن ہو خم، ان کا مٹے نام و نشاں
اسلام کی لیجئے خبر اور کفر کو پہنچے ضرر
کفار ہوں زیر و زبر سب بھول جائیں مستیاں
مسلم کو پھر شوکت ملے، اسلام کو قوت ملے
بد خواہ کو ذلت ملے، اے دینِ حق کے پاسباں
مسلم ہوں باہم متحد، بھائی کا بھائی ہو ممد
مٹ جائے سب آپس کی ضد رشک و حسد سے ہو اماں

مذہبی شاعری کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ وہاں فکر بلند تو ملتی ہے لیکن فنِ لطیف کی کمی شدت سے کھٹکتی ہے یعنی شاعری فکر منظوم کا نمونہ بن کر رہ جاتی ہے یہ خیال بالکل غلط تو نہیں ہے لیکن اردو کے نعت گو شاعروں میں کم از کم

حضرت امام احمد رضا بریلوی، حضرت محسن کاکوروی، علامہ حسن بریلوی پر اس کا انطباق ہرگز نہیں ہوتا اور حضرت صدر الافاضل نے بھی اپنے اکثر اشعار میں شعری لطافت قائم رکھتے ہیں حیرت انگیز فن کارانہ مہارت دکھائی ہے۔ بطور مثال یہ اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں ؎

سراپا نور ہیں وہ نورِ حق نورٌ علیٰ نور
کہ مشکوٰۃ ہے شان ان کی انہیں کیا واسطہ ظل سے
بفضل اللہ نابینا نہیں ہوں کیسے نسبت دوں
کفِ پائے حبیبِ حق کو روئے ماہِ کامل سے

* * *

دیکھئے وہ عارض اور وہ زلفِ مشکیں دیکھئے
صبحِ روشن دیکھئے، شامِ غریباں دیکھئے
جلوہ فرما ہیں جبینِ پاک میں آیاتِ حق
مصحفِ رخ دیکھئے، تفسیرِ قرآں دیکھئے

* * *

تمنائیں مچلتی ہوں عطائیں لطف کرتی ہوں
دعاؤں کی اجابت کر رہی ہو ناز برداری

"ریاضِ نعیم" میں حضرت صدر الافاضل کی تین منقبتیں بھی ملتی ہیں۔ ایک امام عالی مقام حضرت حسین علیہ السلام کی شان میں دوسری حضرت علی اکبر (رضی اللہ عنہ) کی شان میں اور تیسری شبیہ غوثِ اعظم حضرت مولانا شاہ علی حسین اشرفی رحمت اللہ علیہ کی شان میں (یہ بزبان فارسی ہے) تینوں منقبتیں عقیدت و احترام کے بے پایاں جذبات سے لبریز ہیں لیکن میں یہاں حضرت علی اکبر کی منقبت کے کچھ

اشعار پیش کروں گا کہ ان میں شعریت اپنے عروج پر ہے اور فکر کی قامت پر فن کی قبا بالکل چست و درست نظر آتی ہے، یوں کہیئے آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جاتے ہے۔ سراپا نگاری کا ایسا حسین و مصور نمونہ انہیں جیسے مسلم الثبوت اساتذہ کے یہاں ہی ملتی ہے ۔

صورت تھی انتخاب تو قامت تھا لاجواب
گیسو تھے مشک ناب، تو چہرہ تھا آفتاب
چہرہ سے شاہزادہ کے اٹھی ہی تھا نقاب
مہر سپہر ہو گیا خجلت سے آب آب
کاکل کی شام، رخ کی سحر، موسم شباب
سنبل نثار شام فدائے سحر گلاب
شہزادہ مثیل علی اکبر جمیل
بستان حسن میں گل نوشگفتہ شباب
پالا تھا اہل بیت نے آغوش ناز میں
شرمندہ اس کی نازکی سے شیشۂ حباب
خورشید جلوہ گر ہوا پشت سمند پر
یا ہاشمی جو ان کے رخ سے اٹھا نقاب
صولت نے مرحبا کہا شوکت تھی رجز خواب
جرأت نے باگ تھامی شجاعت نے لی رکاب

یہ رواں دواں انداز، یہ زور بیان، تشبیہات کی تازگی، استعاروں کی ندرت، شاعر کا مقام و مرتبہ صف اول میں محفوظ کر لی جاتے۔

اس منقبت میں ۲۱ اشعار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر کرشمہ دامنِ دل

می کنند کہ جا ایجاست کا حامل ہے۔ حضرت صدر الافاضل نے ایک نظم قاتلانِ
بیت کی مذمت میں بھی کہی ہے اس میں جذبات کا سیدھا سادہ بیان اور عبرت کی
تصویر ہے۔

اے ابن سعد رے کی حکومت تو کیا ملی
ظلم و جفا کی [illegible] ملی
اے شمر نابکار شہیدوں کے خون سے
[illegible] ملی
دنیا پرست دین سے منہ موڑ کر لعین
دنیا ملی نہ عیش و طرب کی ہوا ملی

"ریاضِ نعیم" میں تقریباً ۱۶ غزلیں ہیں۔ صنفِ غزل رندی اور بوالہوسی کے لئے بدنام ہے۔ حضرت صدر الافاضل کی غزلوں کا ان سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ یہاں عروسِ غزل نامحرم نہیں بلکہ محرم بن کر ان کے حریمِ فکر میں آتی ہے۔ اور نہایت ادب سے ان کی قلم بوس ہے۔ ان کی غزلیں ہوں یا ان کی فارسی شاعری۔ جو نعت و غزل اور منقبت پر مشتمل ہے، دونوں علاحدہ اور مستقل مطالعے اور مقالے کی متقاضی ہے۔

صنفِ غزل معنوی طور پر حسن شاہد بازی اور کنگھی چوٹی کیلئے مطعون ہے اس کا "ریاضِ نعیم" کی غزلوں میں دور دور تک سایہ نہیں۔ پاکیزہ تغزل فکر کی طہارت جذبات کی تہذیب صنفِ غزل کی نزاکت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔

ریاض نعیم کی یہ ۱۶ غزلیں مستقل ایک الگ اور بھرپور مقالے کی متقاضی ہیں۔ لہٰذا سر دست میں ان سے صرف نظر کرتا ہوں۔

(۸)

مولانا محمد امجد علی اعظمی

پورا نام محمد امجد علی ہے۔ محمد امجد علی محلہ کریم الدین پور قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی) میں ۱۲۹۶ھ / ۹-۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام مولانا حکیم جمال الدین، دادا کا نام مولانا خدا بخش اور پردادا کا نام مولانا خیر الدین تھا۔ ان کے والد ماجد اور جد امجد فن طب اور علم و فضل میں باکمال تھے۔ ابتدائی کتابیں جد امجد سے پڑھیں اس کے بعد اپنے چچیرے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب سے علوم و فنون کی ابتدائی کتابیں پڑھ کر انہیں کے مشورہ سے مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری (م ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) سے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدرسہ حنفیہ جون پور میں داخل ہوئے۔ علوم و فنون کی تکمیل کے بعد مولانا وصی احمد محدث سورتی (م ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۶ء) کے پاس مدرسۃ الحدیث پیلی بھیت میں حاضر ہوئے اور حدیث کا درس لیا اور ۱۳۳۰ھ / ۱۹۰۲ء میں سند حاصل کی۔ ۱۳۲۳ھ میں حکیم عبدالولی چھوائی ٹولہ لکھنؤ سے علم طب حاصل کیا۔ ۱۳۲۴ھ سے ۱۳۲۷ھ تک مولانا وصی احمد سورتی کے مدرسہ میں درس دیا اس کے بعد ایک سال تک پٹنہ میں طب کا کام کیا بعد میں اپنے استاد مولانا وصی حمد سورتی کے کہنے پر طب کا کام چھوڑ کر مولانا احمد رضا بریلوی کے مدرسہ منظر اسلام بریلی میں درس و تدریس کا کام انجام دینے لگے۔ مولانا احمد رضا بریلوی کی صحبت میں رہ کر ان کے علم میں وسعت پیدا ہوئی اور اس وقت کے فقیہوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

مولانا امجد علی بڑے ذہین تھے ذاتی اور خداداد خوبیوں کا یہ عالم تھا کہ خود فرماتے ہیں:-

"کسی کتاب کا یاد کرنے کی نیت سے تین دفعہ دیکھ لینا کافی ہوتا تھا"

حافظہ کی یہ قوت خدا کسی کسی کو بخشتا ہے ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ طالب علمی ہی سے وہ اپنی علمی صلاحیتوں کی داد حاصل کرتے آئے اور آخر عمر تک فراج تحسین حاصل کیا۔

انہوں نے ابتدا ہی سے درس کا اہم فریضہ اپنے لیے چنا اور اسی پیشہ کو اپنی نجات سمجھا۔ ایک لمبے عرصے تک مدرسہ منظر اسلام بریلی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۲۴ء میں صدر المدرسین کی حیثیت سے دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر (راجستھان) چلے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں پھر بریلی واپس آئے اور کچھ دنوں کے بعد نواب حاجی غلام محمد خاں شروانی رئیس ریاست دادوں، علی گڑھ کی دعوت پر مدرس اول کی حیثیت سے دارالعلوم حافظیہ سعیدیہ میں ان کا تقرر ہوا جہاں سات سال تک بحسن و خوبی درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اس کے بعد ایک سال مظہر العلوم کچی باغ، بنارس میں بھی رہے پھر آخر کار ۱۹۴۵ء تک منظر اسلام بریلی میں درس دیا اور پوری زندگی درس و تدریس کی نظر ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے، جو ایک زمانہ میں حیدر آباد دکن میں صدر امور مذہبی رہ چکے تھے ۱۳۵۶ھ کے سالانہ جلسہ امتحان کے موقع پر اپنی تقریر میں مولانا امجد علی صاحب کی مہارتِ درس، اور تبحر علمی کا اعتراف کیا اور کہا کہ "مولانا امجد علی صاحب پورے ملک میں ان چار پانچ مدرسین میں ایک ہیں جنہیں میں منتخب جانتا ہوں۔" ے[۳۶]

غرض کہ مولانا امجد علی صاحب مختلف درس گاہوں کے تجربہ کار عالم تھے۔

جدید ضرورتوں سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ نصاب تعلیم کا بھی انہیں بخوبی تجربہ تھا اسی لیے فروری ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصاب کی تشکیل کے سلسلہ میں جن اہم مدرسین سے رابطہ قائم کیا گیا ان میں مولانا صاحب کا بھی نام تھا۔ ان کا شمار انکے دور کے اعلی پایہ کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ درس کے لئے جن خوبیوں کو اہم مانا جاتا ہے وہ مولانا کا شعار زندگی بن گئی تھی۔ حدیث و تفسیر کے علاوہ مختلف علوم و فنون کا درس بھی اس طرح دیتے کہ طلباء بخوبی سمجھ جاتے۔

مولانا امجد علی صاحب جہاں ایک باکمال مدرس اور خطیب تھے وہیں اعلی مرتبہ مصنف بھی تھے۔ ان کی زبان سادہ، سہل اردو روز مرہ تھی۔ انہوں نے اسلام کی خوب اشاعت کی اور اجمیر کے زمانہ قیام میں نومسلم راجپوتوں میں تبلیغ کا کام بھی بخوبی انجام دیا۔

مولانا امجد علی صاحب کی تقریر خالص علمی مضامین اور قرآن و حدیث کی تفسیر و تفصیل پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ فقہی جزئیات نوک زبان پر رہتی تھی ان ہی خصوصیات کی بنا پر مولانا احمد رضا خاں نے ان کو "صدر الشریعہ" کا لقب دیا۔

اجمیر کے قرب و جوار میں راجہ پرتھوی راج کی اولاد تھی جو اگرچہ مسلمان ہو چکی تھی لیکن ان میں فرائض و واجبات سے غفلت اور مشرکانہ رسوم بہت زیادہ پائی جاتی تھیں۔ مولانا امجد علی صاحب کے ایماء پر ان کے شاگردوں نے ان میں تبلیغ کا پروگرام بنایا تبلیغی جلسوں کا خوشگوار اثر ہوا اور ان لوگوں میں مشرکانہ رسوم سے اجتناب اور دینی اقدار اپنانے کا جذبہ پیدا ہو گیا اس کے علاوہ اردگرد کے بڑے شہروں اور قصبات مثلاً نصیر آباد، لاڈنوں، جے پور، جودھپور، پالی مارواڑ اور چتوڑ وغیرہ میں بھی خود مولانا اور ان کے تلامذہ نے تبلیغی سرگرمیاں برابر جاری رکھیں۔ مولانا کی تقریر ایسی جامع اور مؤثر ہوتی تھی کہ علماء اور مشائخ جھومتے اور داد تحسین دیتے تھے۔

تصنیف و تالیف:-

مولانا امجد علی صاحب ایک صاحب قلم ادیب تھے حالانکہ دوسری مصروفیات کے مقابلے میں تصنیف و تالیف کا کام بہت نہیں ہوا لیکن جو کچھ بھی کام کیا وہ ان کی علمی صلاحیت اور اردو دانی پر بیّن ثبوت ہیں۔ تلاش و تحقیق کے بعد ان کی جو تصنیفات دستیاب ہوئیں ان کی تعداد ۲۵ تک پہنچتی ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱)	حاشیہ شرح معانی لآ ثار	قلمی نسخہ	(عربی)
(۲)	فتاویٰ امجدیہ جلد اول	مطبوعہ الہ آباد ۱۹۷۹ء	(اردو)
(۳)	فتاویٰ امجدیہ جلد دوم	مطبوعہ الہ آباد ۱۹۸۳ء	(اردو)
(۴)	اسلامی اخلاق و آداب	مطبوعہ اکتوبر ۱۹۸۴ء	(اردو)
(۵)	بہار شریعت	پہلا حصہ	(اردو)
(۶)	بہار شریعت	دوسرا حصہ	(اردو)
(۷)	بہار شریعت	تیسرا حصہ	(اردو)
(۸)	بہار شریعت	چوتھا حصہ	(اردو)
(۹)	بہار شریعت	پانچواں حصہ	(اردو)
(۱۰)	بہار شریعت	چھٹواں حصہ	(اردو)
(۱۱)	بہار شریعت	ساتواں حصہ	(اردو)
(۱۲)	بہار شریعت	آٹھواں حصہ	(اردو)
(۱۳)	بہار شریعت	نواں حصہ	(اردو)
(۱۴)	بہار شریعت	دسواں حصہ	(اردو)
(۱۵)	بہار شریعت	گیارہواں حصہ	(اردو)

(۱۶) بہار شریعت	بارہواں حصہ	(اردو)
(۱۷) بہار شریعت	تیرہواں حصہ	(اردو)
(۱۸) بہار شریعت	چودہواں حصہ	(اردو)
(۱۹) بہار شریعت	پندرہواں حصہ	(اردو)
(۲۰) بہار شریعت	سولہواں حصہ	(اردو)
(۲۱) بہار شریعت	سترہواں حصہ	(اردو)
(۲۲) بہار شریعت	اٹھارہواں حصہ	(اردو)
(۲۳) بہار شریعت	انیسواں حصہ	(اردو)
(۲۴) بہار شریعت	بیسواں حصہ (اردو)	
(۲۵) اردو کا قاعدہ	(بچوں کے لیے)	

حاشیہ شرح معانی الآثار:-

مولانا امجد علی اعظمی نے امام ابو جعفر طحاوی (م ۳۲۱ھ) کی معرکتہ الآرا تصنیف "شرح معانی الآثار" پر حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا کثرتِ کار کے سبب یہ کام صرف پہلی جلد تک چل سکا مگر جتنا ہوا اس کی تفصیل یہ ہے کہ جلد اول کا نصف حاشیہ باریک قلم سے ۴۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ میں ۳۵، ۳۶ سطریں ہیں قادری منزل میں دائرۃ المعارف الامجدیہ گھوسی کے دفتر میں اس حاشیہ کا قلمی نسخہ موجود ہے انہوں نے دادوں ضلع علی گڑھ میں قیام کے دوران یہ حاشیہ عربی زبان میں لکھنا شروع کیا اور سات ماہ کی مختصر مدت میں نصف اول پر مبسوط حاشیہ لکھ دیا۔

فتاوی امجدیہ:-

دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے یہ مصنف کے ان فتاوی کا مجموعہ ہے جسے انہوں

نے ۷ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ سے لے کر ۸ شوال ۱۳۶۷ھ تک صادر کیے ہیں پہلی جلد کتاب الطہارت سے شروع ہو کر کتاب الحج پر ختم ہوتی ہے جو ۴۰۳ صفحات پر مشتمل ہے دوسری جلد "کتاب النکاح" سے شروع ہو کر "حدود و تعزیر کا بیان" پر ختم ہوتی ہے یہ ۳۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

مولانا امجد علی صاحب سے مختلف زبانوں میں لوگوں نے سوال کیے اور فتوے پوچھے انہوں نے سفر میں، حضر میں، وطن میں اور باہر ہر جگہ بے شمار فتوے لکھے و بیان کیے ان کے بعض اہم حصے دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہے لیکن آخر میں انہوں نے ایک یا دو جلدیں خاص کر اپنے فتاوی کے لیے سفید کاغذ کی تیار کرائیں اور ان میں اپنے فتاوے اندراج کرائے اور ان فتاوے کی اکثر و بیشتر نقلیں مولانا سردار احمد (محدث پاکستان) کے ہاتھوں کی گئی ہیں۔ مولانا عبدالمنان کلیمی فاضل اشرفیہ مبارکپور نے ان کو فقہی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا اور مولانا مفتی شریف الحق صاحب نے ان فتووں پر بہت مفید حواشی کا اضافہ کیا۔ مولانا امجد علی کے یہ فتاوے دلائل و ترجیحات و عبارات فقہیہ پر مشتمل ہیں۔ ان فتاوے کی زبان نہایت سادہ ہے اور کم الفاظ میں جامع کلام کے ساتھ زیادہ ابلاغ کہنے کی کوشش کی گئی ہے جسے بہت سراہا گیا اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

بہار شریعت:-

مولانا امجد علی اعظمی کی وہ کتاب جو دوسرے مصنفین کی جملہ تصانیف پر بھاری ہے وہ ان کی معرکتہ الآرا تصنیف "بہار شریعت" ہے اس کتاب کے سبب وہ زندہ جاوید ہوتے اس کتاب میں انہوں نے فقہ حنفی کو اردو قالب میں ڈھال کر وقت کی اہم

ضرورت کو پورا کیا ہے اس سے فائدہ حاصل کرنے والوں میں علماء، عوام دونوں شامل ہیں۔ مصنف فقہ اسلامی اور مسائل شرعیہ کو مکمل طور پر بیس جلدوں میں سمیٹنا چاہتے تھے مگر عمر نے ساتھ نہ دیا اور سترہ حصے لکھنے کے بعد دنیائے دار فانی سے ۲ ذی قعدہ، ۶ ستمبر ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء دو شنبہ کو ۱۲ بج کر ۶ منٹ پر انتقال کر گئے اور وصیت کر گئے کہ میری اولاد یا تلامذہ یا علمائے اہل سنت میں سے کوئی صاحب اس کا قلیل حصہ جو باقی رہ گیا ہے اس کو پورا کردیں۔ چنانچہ ان کے شاگرد اور دیگر علماء بہار شریعت کے باقی تین حصے ۱۸، ۱۹، ۲۰ ضبط تحریر میں لاچکے ہیں جو چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ مصنف کی وصیت کے مطابق یہ خیال رکھا گیا ہے اور اس میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ مسائل کے ماخذ کتب کے صفحات کے نمبر اور جلد نمبر بھی لکھ دیئے ہیں تاکہ اہل علم کو ماخذ تلاش کرنے میں آسانی ہو اکثر کتب فقہ کے حوالہ جات نقل کر دیئے ہیں جن پر آج کل فتوی کا مدار ہے۔ حضرت مصنف کے طرز تحریر کو حتی الامکان برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فقہی موشگافیوں اور فقہا کے قیل و قال کو چھوڑ کر صرف مفتی بہ یعنی جس پر فتوی ہے، اقوال کو سادہ اور عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے۔

بہار شریعت (حصہ ۱۸):-

بہار شریعت (حصہ ۱۸) کے مصنف مولانا عبدالمصطفیٰ ازہری ابن مولانا امجد علی، شیخ الحدیث، مولانا وقارالدین، نائب شیخ الحدیث و مولانا قاری محبوب رضا خاں بریلوی مفتی دارالعلوم امجدیہ کراچی ہیں۔ اس کا موضوع جنایات (خون بہا، قصاص، اکسیڈنٹ وغیرہ) ہے۔ اس میں سنہ طباعت کا ذکر نہیں ہے اور نہ مطبع کا ذکر ہے

البتہ ناشر کا نام قادری بک ڈپو، نو محلہ مسجد، بریلی ہے اس کتاب میں صفحات ۱۱۹ اور کل مسائل ۶۵۸ ہیں۔

بہار شریعت (۱۹ واں حصہ):-

یہ حصہ مطبوعہ ہے اس کے مصنف مولانا امجد علی کے شاگرد مولانا سید ظہیر احمد زیدی ہیں۔ اس کتاب کے ۷۲ صفحات ہیں۔ ابتدائے کتاب میں مولانا عبدالمصطفیٰ ازہری اور مولانا قاری رضاالمصطفیٰ کے تذکرے تحریر ہیں۔ اس کے بعد مؤلف کتاب بہار شریعت ۱۹، واں حصہ ظہیر احمد زیدی کا ایک تعارف مکرمی جناب ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم (ہمدرد یونیورسٹی نئی دلی) نے تحریر فرمایا ہے جس میں مصنف سے متعلق اپنے تاثرات، تجربات، اور مشاہدات مختصر انداز میں بیان کئے ہیں پھر ایک مقدمہ ہے جسے مؤلف ہی نے قلمبند فرمایا ہے۔ مؤلف کی ص ۷۲ پر تحریر کے مطابق بہار شریعت ۱۹ واں حصہ کی تالیف مورخہ ۲۹ شوال ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۰ ستمبر ۱۹۸۰ء یوم چہار شنبہ اختتام کو پہنچی۔ اس کتاب میں کل ۸ احادیث اور ۴۴۵ مسئلے ہیں وصایا کے مباحث پر یہ کتاب مشتمل ہے اس کا اختتام ذمی کی وصیت کے بیان پر ہوتا ہے۔

بہار شریعت (۲۰ واں حصہ):-

مولانا امجد علی صاحب کے حسب وصیت اس حصہ کے مصنف مولانا وقار الدین مفتی و نائب شیخ الحدیث دارالعلوم امجدیہ، کراچی ہیں۔ یہ مطبوعہ ہے اس کے ۴۴ صفحات ہیں۔ یہ حصہ وراثت کے بیان میں ہے مسائل بیان کرنے سے پہلے بسلسلہ وراثت آیات قرآنی اور ۱۷ احادیث مذکور ہیں تقریباً اس میں ۱۷۲ مسائل کا بیان

ہے۔ ان سب کے ناشر کا نام قادری بک ڈپو نو محلہ مسجد، بریلی ہے۔ ان میں سنہ طباعت اور مطبع کا ذکر نہیں ہے۔

مولانا امجد علی صاحب کی بہار شریعت کا سترہ حصوں کا تجزیہ اس طرح ہے

بہار شریعت پہلا حصہ:-

اس حصہ میں عقائد سے متعلق مباحث ہیں۔ کتاب میں ۱۲۳ عقیدے بیان کئے گئے ہیں۔ جن مسائل پر گفتگو کی گئی ہے ان کی تعداد ۱۲۵ ہے اہم عقیدوں کی سرخیاں اس طرح ہیں۔

ذات و صفات باری تعالیٰ، عقائد نبوت، ملائکہ، جن، جنت و دوزخ، ایمان و کفر، امامت و ولایت، عالم برزخ اور معاد و حشر، وغیرہ۔ جہاں مصنف نے معاد و حشر کا کیا ہے وہاں انہوں نے اس کے ضمن میں ۲۸ نشانیاں شمار کرائی ہیں۔

بہار شریعت دوسرا حصہ:-

یہ کتاب، کتاب الطہارت کے ابواب و فصول پر مشتمل ہے اس میں ۱۸۹ احادیث اور ۲۶۲ مسائل کا ذکر ہے۔ وضو، غسل، تیمم، حیض، نفاس، استحاضہ، موزوں پر مسح، نجاستوں اور استنجا کے بیان اس کے مباحث ہیں۔

اس حصہ کی تکمیل غالباً ۱۳۳۵ھ میں ہوئی اس کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی ہے جو حقہ سے متعلق کئے گئے اعتراضات کا جواب ہے جس کے آخر میں اس دور کے جلیل القدر علماء کی تصدیقات بھی ہیں۔

بہار شریعت تیسرا حصہ:-

نماز جیسی اہم عبادت سے شروع ہو کر احکام مسجد کے بیان پر ختم ہوتی ہے اس میں کل ۲۴۳ احادیث اور ۸۴۲ مسائل ہیں۔ اس کے اہم مباحث اس طرح ہیں۔ نماز، وقت نماز، اذان، شرائط نماز، طریقہ نماز، مسئلہ درود، بعد نماز ذکر و دعا، تلاوت قرآن مجید، قراءت میں غلطی، امامت، جماعت، مکروہات اور احکام مسجد وغیرہ، کتاب کے آخر میں مولانا احمد رضا بریلوی کی تقریظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب رمضان ۱۳۳۷ھ میں مکمل ہوئی۔

بہار شریعت چوتھا حصہ:-

اس کتاب میں وتر کا بیان، وتر کے فضائل، سنن و نوافل کا بیان، نماز است تراویح کا بیان، قضا نماز کا بیان، سجدہ سہو، سجدہ تلاوت، نماز مسافر، نماز مریض، نماز جمعہ، نماز عیدین، نماز استسقاء، نماز خوف، کتاب الجنائز، بیماری کا بیان، قبر و دفن، تعزیت، شہید کا بیان وغیرہ جیسے اہم مسائل درج کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں کل ۱۷۶ احادیث اور ۸۱۰ مسائل کا ذکر ہے ۱۳۳۷ھ ہی میں غالباً یہ حصہ بھی تکمیل کو پہنچی ہے۔

بہار شریعت پانچواں حصہ:-

اس کتاب کی ابتدا زکواۃ کے مسائل سے ہوتی ہے اور مسائل اعتکاف پر اس کا اختتام ہوتا ہے اس میں ۲۵۳ احادیث اور ۵۲۰ مسائل ہیں۔

بہار شریعت چھٹواں حصہ :-

اس حصہ میں ۱۱۵ احادیث اور ۴۷۵ مسائل ہیں یہ حصہ حج کے فضائل و مناسک پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حج کے جن مسائل کی سرخی قائم کی گئی ہے اس کی ترتیب اس طرح ہے۔ حج کا بیان، میقات کا بیان، احرام کا بیان، داخلہ حرم محترم و مکہ مکرمہ و مسجد الحرام، طواف و سعی صفا و مروہ و عمرہ کا بیان، منٰی کی روانگی اور عرفہ کا وقوف، مزدلفہ کی روانگی اور اس کا وقوف، منٰی کے اعمال اور حج کے بقیہ افعال، قران کا بیان، تمتع کا بیان، جرم اور ان کے کفارے کا بیان، محصر کا بیان، حج فوت ہونے کا بیان، حج بدل کا بین، حج کی منت کا بیان، فضائل مدینہ طیبہ۔

بہار شریعت ساتواں حصہ :-

یہ حصہ نکاح کے مسائل پر مشتمل ہے اس میں ۴۸ احادیث اور ۴۰۸ مسائل کا ذکر ہے اس کے اہم موضوعات اس طرح ہیں۔

نکاح کا بیان، محرمات کا بیان، دودھ کے رشتے کا بیان، ولی کا بیان، کفو کا بیان، نکاح کی وکالت کا بیان، لونڈی غلام کے نکاح کا بیان، نکاح کافر کا بیان، باری مقرر کرنے کا بیان، حقوق الزوجین، شادی کے رسوم۔

بہار شریعت آٹھواں حصہ :-

یہ کتاب ۱۲۱ احادیث اور ۷۴۲ مسائل پر مشتمل ہے اس میں طلاق کے مسائل مع کلیات و جزئیات بیان کئے گئے ہیں اس کی تکمیل ۲۲ ربیع الآخر ۱۳۳۸ھ کو ہوئی اس میں مندرجہ ذیل مسائل کو دل نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

طلاق کا بیان، صریح کا بیان، اضافت کا بیان، غیر مدخولہ کی طلاق کا بیان، کنایہ

کابیان، تعلیق کابیان، استثنا کابیان، طلاق مریض کابیان، رجعت کابیان، ایلا
بیان، خلع کابیان، کفارہ کابیان، نفقہ کابیان، یہ اس کتاب کی اہم سرخیاں ہیں
کے ضمن میں اس کے متعلقہ مسائل کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کتاب
اختتام جس مسئلہ پر ہوتا ہے وہ جانور پر بوجھ لادنے سے متعلق ہے۔

بہار شریعت نواں حصہ:-

اس حصہ میں درج ذیل مسائل پر گفتگو کی گئی ہے

آزاد کرنے کا بیان، مدبر و مکاتب وام ولد کا بیان، قسم کا بیان، قسم کے کفارہ کا بیان، منت کا بیان، مکان میں رہنے اور جانے سے متعلق قسم کا بیان، کھانے پینے کی قسم کا بیان، کلام کے متعلق قسم کا بیان، طلاق دینے اور آزاد کرنے کی یمین۔ خرید و فروخت و نکاح وغیرہ کی قسم، نماز و روزہ و حج کی قسم کا بیان، لباس کے متعلق قسم کا بیان، حدود کا بیان، کہاں حد واجب ہے کہاں نہیں، زنا کی گواہی دے کر رجوع کرنا، شراب پینے کی حد کا بیان، راہزنی کا بیان، حد قذف کا بیان، تعزیر کا بیان، چوری کی حد کا بیان، ہاتھ کاٹنے کا بیان، کتاب السیر، غنیمت کا بیان، غنیمت کی تقسیم کا بیان، استیلائے کفار کا بیان، مستامن کا بیان، عشر و خراج کا بیان، جزیہ کا بیان، مرتد کا بیان۔

اس میں کل ۱۱۸ احادیث اور ۶۵۶ مسائل ہیں اس کی تکمیل ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ میں ہوئی۔

بہار شریعت دسواں حصہ:-

اس حصہ کی تکمیل ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ کو ہوئی۔ اس میں ۱۲۵

احادیث اور ۵۶۱ مسائل کا ذکر ہے اس کی ابتدا لقطہ کے بیان سے ہوتی ہے اور اختتام وقف مریض پر ہے اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مباحث اس میں ہیں۔

لقیط کا بیان، مقصود کا بیان، شرکت فاسدہ کا بیان، شرکت کا بیان، وقف کا بیان، کس چیز کا وقف صحیح ہے، مصارف وقف کا بیان، اولاد یا اپنی ذات پر وقف کا بیان، مسجد کا بیان، قبرستان وغیرہ کا بیان، وقف میں شرائط کا بیان، تولیت کا بیان، اوقاف کے اجارہ کا بیان، دعویٰ اور شہادت کا بیان۔

بہار شریعت گیارہواں حصہ:-

اس حصہ میں ۹۶ احادیث اور ۶۶۷ مسائل ہیں۔ خرید و فروخت کے بیان سے اس حصہ کا آغاز ہوتا ہے اور اس کا اختتام بیع صرف کے مسئلہ پر ہوتا ہے اس کے علاوہ کتاب کی درج ذیل سرخیاں اہم ہیں۔

خیار شرط کا بیان، خیار عیب کا بیان، بیع فاسد کا بیان، بیع مکروہ کا بیان، اقالہ کا بیان، رابحہ و تولیہ کا بیان، بیع و ثمن میں تصرف کا بیان، قرض کا بیان، سود کا بیان، حقوق کا بیان، استحقاق کا بیان، بیع سلم کا بیان، استصناع کا بیان، بیع صرف کا بیان۔

بہار شریعت بارہواں حصہ:-

اس حصہ میں ۴۱ احادیث اور ۵۶۸ مسائل ہیں شروع کتاب میں کفالت کی اصطلاحی تعریف ہے اس کے بعد کفالت کے مسائل بیان کئے گئے ہیں پھر بالترتیب درج ذیل موضوعات پر عالمانہ سنجیدہ گفتگو ہے۔

حوالہ کا بیان، قضا کا بیان، انکار کے مسائل، تحکیم کا بیان، گواہی کا بیان،

شہادت میں اختلاف کا بیان، شہادت علی الشہادت کا بیان، گواہی سے رجوع کرنے کا بیان، وکالت کا بیان، خرید و فروخت میں توکیل کا بیان، وکیل بالخصومت و وکیل بالقبض کا بیان، وکیل کو معزول کرنے کا بیان۔

بہار شریعت تیرہواں حصہ:-

اس کا آغاز "دعویٰ کا بیان" سے ہوتا ہے۔ اس میں ۱۲ احادیث اور ۲۰۰ مسائل ہیں۔ اس کے دوسرے موضوعات یہ ہیں۔

حلف کا بیان، تحالف کا بیان، دعویٰ دفع کرنے کا بیان، دو شخصوں کے دعویٰ کرنے کا بیان، دعوائے نسب کا بیان، اقرار کا بیان، استثناء اور اس کے متعلقات کا بیان، نکاح و طلاق کا اقرار، دین کا اقرار، اقرار مریض کا بیان، اقرار نسب، صلح کا بیان، دعوائے دین میں صلح کا بیان، تخارج کا بیان، غصب و سرقہ و اکراہ میں صلح، [illegible] میں صلح، بیع میں صلح، صلح میں خیار، جائداد غیر منقول میں صلح، یمین کے متعلق صلح وغیرہ۔

اس کتاب کے آخر میں صلح سے متعلق کچھ احادیث اور آیات ہیں جو شاید درمیان کتاب میں صلح کا موضوع پر [illegible] رہ گئے تھے۔

بہار شریعت چودہواں حصہ:-

اس حصہ میں ۲۴ احادیث اور ۳۲۷ مسائل ہیں مندرجہ ذیل موضوعات پر اس کتاب میں تفصیلی بحث ہے۔

مضاربت کا بیان، ودیعت کا بیان، عاریت کا بیان، ہبہ کا بیان، ہبہ واپس لینے کا بیان، اجارہ کا بیان، دایہ کے اجارہ کا بیان، اجارہ فاسدہ کا بیان، ضمان اجیر کا

بیان، اجارہ فسخ کرنے کا بیان، ولا کا بیان۔

بہار شریعت پندرہواں حصہ:-

اس حصہ میں ۸۴ احادیث اور ۶۲۵ مسائل ہیں اکراہ کے بیان سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ حجر، بلوغ، ماذون، غصب، مغصوب چیز میں تغیر، طلب شفعہ، شفعہ کے مراتب، شفعہ باطل ہونے کی وجہ، تقسیم مہایاۃ، مزارعت، معاملہ، ذبح، حلال و حرام جانور، قربانی، عقیقہ، قربانی کے جانوروں کا بیان، اس کتاب کے دوسرے موضوعات ہیں۔

بہار شریعت سولہواں حصہ:-

اس حصہ میں ۲۰۱ احادیث اور ۵۴۴ مسائل ہیں اس کتاب میں جن مسائل کو موضوع قلم بنایا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

حظر و اباحت۔ پانی پینے کا بیان، ولیمہ، ضیافت، ظروف، خبر کہاں معتبر ہے، لباس، عمامہ، جوتا، انگوٹھی اور زیور کا بیان، برتن چھپانے اور سونے کے وقت کے آداب، بیٹھنے، سونے اور چلنے کے آداب، دیکھنے اور چھونے کا بیان، مکان میں جانے کے لیے اجازت لینا، سلام، مصافحہ، معانقہ، چھینک اور جماہی، خرید و فروخت کا بیان، آداب مسجد و قبلہ، قرآن مجید پڑھنے کے فضائل، عیادت، علاج، لہو و لعب، اشعار، جھوٹ، بغض و حسد، غصہ و تکبر، سلوک کا بیان، ہجر و قطع تعلق کی ممانعت، پڑوسیوں کے حقوق، اللہ کے لیے دوستی و دشمنی، حجامت بنوانے و ناخن ترشوانے کا بیان، ختنہ، زینت، مسابقت کسب، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ریا و سمعہ، اور زیارت قبور کا بیان، ایصال ثواب مجالس خیر، آداب سفر وغیرہ۔

بہار شریعت سترہواں حصہ:-

تحری کے بیان سے اس حصہ کا آغاز ہوتا ہے اس میں ۲۹ احادیث اور ۲۰۰ مسائل ہیں اس حصہ کی تکمیل ۱ ربیع الآخر ۱۳۷۱ھ میں ہوئی یہ مصنف کی اس سلسلے کی آخری کڑی ہے اس میں درج ذیل مباحث کا ذکر ہے۔

احیاء موات، شراب و شربہ، شکار، جانوروں سے شکار، رہن، شئی مرہون کے مصارف کا بیان، مرہون میں تصرف، کس چیز کو رہن رکھ سکتے ہیں، باپ یا وصی کا نابالغ کی رہن رکھنا، رہن میں جنایات کا بیان، کہاں قصاص واجب ہوتا ہے، اطراف میں قصاص کا بیان۔

مصنف نے بہار شریعت میں اعتماد و یقین کے ساتھ مسائل بیان کئے ہیں اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مسائل کا جس انداز سے احاطہ کیا ہے بلاشبہ وہ انہیں کا حصہ ہے۔ سارے بیان کئے ہوئے مسائل کی نشاندہی و پھر اس کا تجزیہ کرنا اور دلائل اور لب و لہجہ کے اعتبار سے اس کی اہمیت واضح کرنا وقت طلب کے ساتھ ساتھ دقت طلب بھی ہے مگر مصنف نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ مثلاً مصنف نے طہارت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کتاب میں جگہ جگہ آب مطلق اور آب مقید سے بحث کی ہے (انہوں نے اس کے ضمن میں یہ بھی لکھا ہے کہ حقہ کا پانی پاک ہے۔ اگرچہ رنگ و بو مزہ میں تغیر آجائے اس سے وضو جائز ہے بقدر کفایت اس کے ہوتے ہوئے تیمم جائز نہیں)۔

اسلامی اخلاق و آداب:-

مولانا امجد علی اعظمی کی یہ تصنیف اسلامی اخلاق و آداب پر ایک بہترین کتاب

ہے جو مسلم معاشرہ کے لیے لائحہ عمل ہے۔ یہ مجموعی اعتبار سے ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت زرق الماسی قادری رامپوری نے کی ہے۔ جدید ترتیب، تصحیح، تعلیق، تقدیم مولانا محمد احمد مصباحی بھیروی استاد عربی جامعہ اشرفیہ مبارکپور کی ہے۔ یہ کتاب اکتوبر ۱۹۸۶ میں دو ہزار چھپی تھی۔ ناشر المجمع الاسلامی فیض العلوم محمد آباد گوہنہ ہے۔

ان تمام اخلاقی و آدابی مسائل کو احادیث کی روشنی میں بیان کیا ہے اس کی زبان سہل، سادہ اور عام فہم ہے احادیث کے اردو ترجمے پیش کیے گئے ہیں۔ کھانے سے متعلق ۶۵ احادیث ہیں اس کے علاوہ باقی مختلف موضوعات پر کل ۸۰۶ احادیث کریمہ درج ہیں۔ اسلوبِ بیان دلکش، سادہ اور اردو زبان عام بول چال سے بالکل قریب ہے۔

مولانا امجد علی صاحب کے یہ تصنیفی کارنامے دنیائے اردو ادب میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ اور اردو کے سرمائے میں بلاشبہ ایک اضافہ ہیں۔ ان کے ان کارناموں کی بدولت انہیں اردو کا ایک ممتاز ادیب کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

(۹)

مولانا سید محمد سلیمان اشرف بہاری

سید محمد سلیمان اشرف نام تھا ان کے والد ماجد حکیم سید محمد عبداللہ طریقت و شریعت کے ایک بزرگ اور درویش منش انسان تھے۔ مولانا سید محمد سلیمان اشرف ۱۸۷۸ء کے لگ بھگ صوبہ بہار کے ایک مردم خیز دیہات میر داد قصبہ بہار

(پٹنہ) میں سید گھرانے کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت گھر ہی میں ہوئی۔ کم عمری میں ان کو مولانا محمد احسن ستھانوی کی سرپرستی میں دے دیا گیا ان سے چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لئے مدرسہ ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے لیکن یہاں زیادہ دنوں تک رک نہ سکے اور جلد ہی مولانا محمد ہدایت اللہ خاں جونپوری (م ۱۹۰۸ء) کے مدرسہ حنفیہ میں داخلہ لے کر انہوں نے اسلامی علوم اور منطق و فلسفہ کی آخری کتابیں ختم کیں اور استاد کی حیات تک یہیں مقیم رہے۔ اس کے علاوہ مولانا یار محمد بندیالوی سے بھی استفادہ علمی کیا۔ مولانا سید محمد سلیمان اشرف کو اپنے استاد مولانا محمد ہدایت اللہ خاں جون پوری سے بے حد محبت و عقیدت تھی سید سلیمان ندوی صاحب لکھتے ہیں:-

> "مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم کو حقیقت یہ ہے کہ اپنے استاد کے ساتھ عقیدت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ ان کے حالات جب کبھی وہ وہ سناتے تو ان کے طرز بیان اور گفتار کی ہر ادا سے ان کی والہانہ عقیدت تراوش کرتی تھی۔" ے[۳۷]

اپنے استاد کے علاوہ مولانا شاہ احمد رضا بریلوی سے بھی انہیں خاص عقیدت تھی وہ ان کے خلیفہ بھی ہوئے۔

مولانا سید سلیمان اشرف بڑی جامع اور متنوع شخصیت کے مالک تھے۔ طبیعت میں خودداری اور عزت نفس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آواز میں بڑا رعب اور جلال تھا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی گیا کے بہار نمبر "ندیم" میں لکھتے ہیں "مولانا سلیمان اشرف بڑے طنطنہ کی شخصیت تھے" شکل و صورت کے اعتبار سے وجیہ و باوقار شخصیت کے مالک تھے بقول سید سلیمان ندوی کے

> "آپ سلیمانوں میں نامور اور برتر تھے۔" ے[۳۸]

مولانا خوددار اور اپنے مسلک میں سخت مزاج ضرور تھے لیکن ان میں بدکرداری نہیں تھی چنانچہ پروفیسر رشید احمد صدیقی تحریر فرماتے ہیں۔

> "مرحوم مذہبی معتقدات میں بڑا غلو رکھتے تھے اور اظہار کا موقع آتا تو کھلا کھلم ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے تھے بایں ہمہ مختلف الخیال لوگوں سے بھی بقول ان کے کھاتا کھلا ہوا تھا خانقاہ سلیمانیہ کے مقربین میں محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا ابو بکر صاحب، محمد مقتدی خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ بہادر، سعید زین الدین صاحب تھے۔ باہر والوں میں سے مولوی ابوالحسن صاحب، سید بہاء الدین صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا۔ مولانا ابو بکر (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی) کے بڑے مداح تھے ایک دن کہنے لگے جب یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو رہا تھا تو میں کچھ تذبذب میں تھا تم تو جانتے ہو ان کا مسلک میرے مسلک سے جدا ہے میں سمجھتا تھا شاید میرا ان کا نباہ نہ ہو سکے لیکن یہ آدمی بے نظیر نکلا۔" ۳۹

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب ایک بڑے خطیب تھے یہی وجہ ہے کہ مولانا احمد رضا بریلوی نے جمعیت علما کے جلسہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلہ میں ان کو مدعو کیا تھا ان کی تقریر کو خود آزاد صاحب نے سراہا اور داد دی۔

۱۹۰۲ء میں جب مولانا سید سلیمان اشرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے چیرمین مقرر ہوئے تو انٹرویو میں ایک مقالہ "معجزہ" لکھنے کو کہا گیا اور ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ کتابوں کے مطالعے کی ضرورت ہو تو حبیب گنج چلے جائیں مولانا نے کہا کہ بحمداللہ مجھے کتابوں کی ضرورت نہیں ہے صرف کاغذ اور قلم کی ضرورت

ہے چنانچہ عشاء کی نماز کے بعد سے صبح کی نماز تک ایک ہی مجلس میں بائیس فل اسکیپ صفحات پر مدلل مضمون قلمبند کر دیا جو بہت پسند کیا گیا پھر جمعہ کی نماز کے بعد "توحید" پر خطاب کرنے کے لیے کہا گیا تو مولانا نے تین گھنٹے تک اس موضوع پر تقریر فرمائی جو سامعین کے لیے مؤثر ثابت ہوئی۔ اس تقریر میں دینیات کمیٹی کے تمام اراکین، نواب وقارالملک، مشتاق حسین اور مولانان حبیب الرحمن شروانی موجود تھے اسی دن پچاس روپئے مشاہرہ پر مولانا سلیمان اشرف کی تقرری کر دی گئی۔ انہوں نے مرتے دم تک بحسن و خوبی اپنے منصبی فرائض انجام دیئے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات میں ہزاروں افراد کو علم و فضل سے سیراب کیا۔ ان کے شاگردوں میں فضل الرحمن انصاری اور پروفیسر رشید احمد صدیقی وغیرہ بہت اہم ہیں۔

درس و تدریس کا طریقہ یہ تھا کہ ہر دن نماز عصر کے بعد قرآن پاک کا درس دیتے تھے وہ بڑے نادر نکتے بیان کرتے قاری محمد انوار انہیں قلمبند کر لیتے تھے۔ مولانا سید محمد سلیمان اشرف نہ صرف بہترین معلم تھے بلکہ ایک سلجھے ہوئے ماہر تعلیم بھی تھے۔ ۱۹۲۵-۲۶ء میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے میٹرک سے لے کر ایم۔ اے تک کی دینیات کی جماعتوں کے لیے ایک نئے نصاب کے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس کمیٹی میں مولانا حبیب لارحمان خاں شیروانی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا امجد علی جیسی شخصیات کے ساتھ سید سلیمان اشرف کو بھی شامل کیا گیا۔

مولانا سید محمد سلیمان اشرف برصغیر کے ان ممتاز علماء کی صف میں نظر آتے ہیں جنہیں خدائے بزرگ نے سیاسی بصیرت سے نوازا تھا اور جن کا دل ملت کی فکری بیداری اور ان کے روشن مستقبل کے لیے آشنائے درد تھا اس ضمن میں انہوں نے بھی اپنے کرب آگہی کی داستان اردو زبان اور اسلامی ادب کے سانچے میں پیش کی ہے۔ ان

کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ان کی تصنیف النور، البلاغ، اور الرشاد کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔ جن علمائے کے سیاسی رجحانات اور ان کی کارکردگی نے برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے ان میں سید سلیمان اشرف کا نام ممتاز نظر آتا ہے۔ جنہوں نے ملک کی آزادی و ملی بیداری کے لیے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں بھرپور کوشش کی۔ مولانا سید سلیمان اشرف نے نہ صرف فکری بلکہ عملی جہاد کر کے مسلمان قوم اور اسلامی درسگاہوں کو بچانے کی بھرپور کوشش کی اس کوشش میں اکثر ان کی جھڑپ مولانان محمد علی سے ہو جاتی اور گرما گرم بحث و مباحثہ چلتا رہتا۔ اس سلسلہ میں وہ سرسید کے ہم خیال تھے ڈاکٹر عبدالباری کے بقول۔

> "آپ (مولانا سید سلیمان اشرف) کی تحریروں میں سرسید کے تعلیمی مشن اور اصلاح ملت و معاشرہ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔"[۴۰]

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی سرپرستی اور مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں چلنے والی تحریک خلافت ہندوستان کی ایسی ہنگامہ خیز نوائی تحریک تھی جس نے کشمیر سے کنیا کماری تک اور ہندوستان کے طول و عرض میں مسلم جذبات کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے بعد پہلی بار اس تحریک نے مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کا شعور بخشا اور خلافت کے نام پر مر مٹنے کا ارمان ان کے سینوں میں انگڑائیاں لینے لگا۔

لیکن ۱۹۱۹ء میں چلائی گئی یہ تحریک محض جذبات کی بنیاد پر اٹھی تھی اور اس کی کوئی فکری اساس و بنیاد نہ تھی اس لیے دو تین سالوں کے اندر اندر اسے عبرت ناک ناکامی سے دوچار ہونا پڑا اور ۱۹۲۲ء میں اس تحریک کی کمر اس وقت اور ٹوٹ گئی جب مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا اعلان کر کے اختیار اور اقتدار

کی لگام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا بلکہ اس سے پہلے ہی بڑی ذہانت اور منصوبہ بندی کے ساتھ مسلم جذبات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر گاندھی اور دوسرے لیڈروں نے اسے تحریک ترک موالات (نان کو آپریشن موومنٹ) میں تبدیل کر کے اس کی ہیئت ترکیبی ہی کے اندر سیاسی آمیزش کر ڈالی تھای اور ایک دینی تحریک کو سیاسی تحریک کا رنگ دے دیا تھا۔

مولانا احمد رضا بریلوی، مولانا مفتی مظہر اللہ دہلوی اور مولانا سید محمد سلیمان اشرف وغیرہ نے یہ بتانے کی بہتیرا کی کہ یہ خلافت شرعی خلافت نہیں ہے اور اپنی ناتوانی و بے سروسامانی کے سبب ہم ترکی یا عرب جا کر خلافت قائم کرنے کے شرعا مکلف نہیں، رہ گئی بات ترکوں کی تو صرف ترک ہی کیا بلکہ دنیا کے ہر مسلمان کی ممکن امداد و اعانت دنیا کے ہر مسلمان پر فرض ہے اس لیے جو کام اپنی استطاعت کے اندر ہے صرف اسی کو انجام دیا جانا چاہیے اور ساری قوم کو جذبات کے سیلاب میں بہا کر مشکلات و مصائب کا شکار بنا دینا خیر خواہی اسلام و مسلمین کے بالکل خلاف ہے مگر تحریک خلافت کے قائدین اور اکثر مسلمانوں نے اس وقت ان کی بات نہیں سنی اور قومی لیڈروں کے شور و غوغا میں ان کی آواز دب کر رہ گئی۔ اس زمانے کے ایک عینی شاہد نواب مشتاق احمد خان لکھتے ہیں:-

> "ان تین چار ہنگاموں کے بعد مسلمان یہ عام طور پر محسوس کرنے لگے کہ انہوں نے جذبات کی رو میں بہہ کر اپنا ہی نقصان کیا۔ علی گڑھ میں تعلیمی سال کی بربادی ہوئی۔ نظم و ضبط متاثر ہوا اور اس سارے دور میں بنارس ہندو یونیورسٹی پر کوئی آنچ نہ آئی۔۔۔۔ علی گڑھ قربانی کا بکرا بنایا۔" [۴۱]

اس زمانہ میں جمعیتہ العلما (ہند) کے رہنماؤں نے بریلی میں ایک جلسہ منعقد کرنے

کا پروگرام بنایا تاکہ عدم تعاون کے مخالف گروہ اور حقوق اسلامی کے محافظ گروہ کا زور توڑا جاسکے اور اس سلسلہ میں دو اشتہار ایک "آفتاب صداقت" کے عنوان سے اور دوسرا "بنام "زندگی مستعار کی چند ساعتیں" شائع کیے۔ جمعیت علمائے ہند کے مخالف گروہ نے، جو اس نظریئے سے متفق نہیں تھا، مقابلہ کی تیاری کا آغاز کر دیا اور علی گڑھ سے مولانا سید سلیمان اشرف کو خصوصاً دعوت اس لیے دی گئی کہ وہ اس مسئلہ پر مولانا ابوالکلام آزاد سے بات چیت یا ضرورت ہو تو مناظرہ کرسکیں۔ مولانا ۱۲ رجب کو بریلی پہنچے اور جلسہ کی کاروائی میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا۔ مولانا سید سلیمان اشرف کو صدر جلسہ بریلی، مولانا ابوالکلام آزاد نے ۳۵ منٹ تقریر کرنے کا وقت دیا۔ انہوں نے اس خوبی سے تقریر کی کہ اپنے اعتراضات بھی پیش کر دیئے اور ان کی غلطیاں بھی دکھائیں۔ مولانا کی تقریر میں قربانی ترک کرنے، شعائر اسلام کو چھوڑنے اور شعائر کفر میں مبتلا ہونے کا تذکرہ تھا۔ ان کی یہ تقریر بڑی مفصل تھی جو اسی زمانہ میں اراکین جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی نے "روداد مناظرہ" میں شائع کرادی۔

۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک اور تحریک خلافت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی وغیرہ کا تھا اور دوسرا گروہ محمد علی جناح کا۔ بریلوی علماء آزاد صاحب کے گروہ کے نظریے کے مخالف تھے تاکے ان علماء میں مولانا احمد رضا بریلوی اور مولانا سید سلیمان اشرف بہاری کے نام نمایاں ہیں۔ محمد رضا انصاری فرنگی محلی کے لفظوں میں:-

> "۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک شروع ہو کر زور و شور سے چل رہی تھی کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند مشترکہ طور پر اس مہم میں شریک تھیں مسلمانوں کا ایک گروہ جو ایک خاص مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا اس تحریک

> کے خلاف تھا۔ مخالفت کا ایک خاص مرکز بریلی (یو۔ پی) تھا، جہاں مولانا احمد رضاں خاں بریلوی اس تحریک کے خلاف شرع ہونے کا فتویٰ دے چکے تھے جمعیۃ العلماء ہند کا ایک جلسہ اس تحریک ترک موالات کی تبلیغ کے سلسلے میں بریلی میں منعقد کیا گیا، جس کی صدارت مولانا آزاد نے کی "۴۲

مولانا سید محمد سلیمان اشرف کی بعض تصانیف میں ان تمام سیاسی امور کا ذکر ہے جن کا تعلق مسلمانوں سے تھا خلافت کا جھگڑا ہو یا ترک موالات کا، مسلمانوں کی تعلیمی تنزلی کا مسئلہ ہو یا ان سے متعلق پیدا ہونے والے مسائل کا ان سب پر ان کی گہری نظر تھے۔ قوم کے لیے کس حال می. بہتر کیا ہو گا اس کا انہیں بخوبی انداز تھا لہذا اپنی کتاب النور میں رقمطراز ہیں

> "جس قوم کے پاس نہ دولت نہو نہ اخلاق ہو نہ علم ہو نہ تدین ایسی گری ہوئی مردہ قوم کے سامنے وہ پیش کرنا جو کسی زندہ قوم کے لیے سزاوار تھا خیر خواہی نہیں بلکہ بد خواہی ہے۔" ۴۳

۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کا زمانہ خلافت تحریک کا شباب کا زمانہ تھا اس تحریک کے بارے میں سید سلیمان اشرف تحریر فرماتے ہیں:۔

> "جس وقت ساری زبانیں گنگ تھیں مجھ گنہگار کی زبان کلمہ حق کہہ رہی تھی جس وقت سارے اقلام خاموش تھے، مجھ بے بضاعت کا قلم مصرف تحریر تھا، جس وقت سارے پاؤں متزلزل میں تھے منزل رساں راستہ پر تھا، انصاف کرو اس میں میری کیا خطا ہوتی یہ تو اللہ کا فضل تھا، تم ہلال احمر کے نام سے چندہ تحصیل کرتے تھے اور داد نشاط و عیش دیتے تھے۔ زرکشی

> کے لیے جس طرح کے مضامین ضروری تھے تم انہی کو لکھتے، انہی کو کہتے تھے لیکن اس فقیر کو خلافت کی لو لگی تھی اس لیے ترکوں کی مختصر تاریخ بحران کی خلافت ان کی اطاعت اور ان کے حقوق دلیل و برہان کے ساتھ لکھ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا۔" ؎ ۴۴

اس دوران مولانا نے مسلمانوں کی فکری بے راہ روی پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے یہ رباعی تحریر فرمائی ؎

[illegible] دست غمیں، بیا مرز میپرس
صد واقعہ در آیں، بیا مرز میپرس
شرمندہ شوم اگر بپرسی عملم
یا اکرم الاکرمیں، بیا مرز میپرس ۴۵

خلافت عثمانیہ اپنے زمانہ عروج میں ان علاقوں پر حکمراں تھی، بحر قزوین، خلیج فارس، بحر روم، بحر اسود، اناطولیہ، انگورا، قسطنطنیہ، سلیمیا، دمشق، بیروت، بیت القدس، بصرہ، بغداد، مقدونیا، البانہ، طرابلس، اسکندریہ، کربلا، موصل، حرمین شریفین، بحر قلزم، طائف، صنعا، یمن، عدن، مسقط وغیرہ اس عروج کے بعد زوال ہوا جس کی ایک جھلک مولانا سید سلیمان اشرف یوں بیان فرماتے ہیں:-

> " اٹلی حملہ آور ہوا، جنگ طرابلس شروع ہوئی، نوجوانوں نے چندہ کی بنیاد ڈالی، جو جنگ بلقان تک جاری رہی اس عرصہ میں اٹلی کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا حتیٰ کہ ترکی ٹوپیاں، جو ترکوں کا نشان تھیں لیکن اٹلی سے بن کر آتی تھیں، سر براہ جلا دی گئیں۔

> لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جب ہندوستانی فوجیں اس جنگ میں ترکوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجی جانے لگیں تو کسی نے کچھ نہ کہا بلکہ مسٹر گاندھی نے فوجوں کو بھیجنے اور سپاہی بھرتی کرانے میں بڑی جدوجہد کی۔ حتی کہ ان کی صحت خطرناک حالت میں مبتلا ہو گئی۔" ۴۶

اسی کش مکش کے دور میں جبکہ کالجوں کے الحاق کرنے اور ان کی امداد ترک کرنے کی بحث چھڑی تھی مدن موہن مالویہ جی نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے لیے چندہ کی وصولی کے لیے بمبئی کا دورہ کیا اور خوب خوب پیسہ وصول کیا ان کی اس کامیابی کا ذکر مولانا سلیمان اشرف یوں کرتے ہیں:-

> "انہیں ایام جب کہ کالجوں کے الحاق و ترک امداد مالی کا مسئلہ اٹھایا گیا پنڈت مالویہ جی ایک ہفتہ کے لیے بمبئی کا سفر کرتے ہیں اور سات دن میں اس قدر روپیہ لے آتے ہیں جس قدر مسلمانوں کا کل سرمایہ یونیورسٹی ہے" ۴۷

اس کے علاوہ انہوں نے النور میں ان تمام سیاسی سرگرمیوں اور فرنگی چالوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے سبب ہم وطن آپس میں لڑ رہے تھے۔

تصنیف و تالیف:-

سید سلیمان اشرف صاحب مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات سے ۳۰ سال تک وابستہ رہے اور اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ صاحب طرز ادیب تھے ان کی تقریباً ۹ کتابیں ملتی ہیں جو حسب ذیل ہیں

(۱) المبین مطبوعہ علی گڑھ (اردو)
(۲) الحج مطبوعہ علی گڑھ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء (اردو)
(۳) امتناع النظیر پر حاشیہ و تصحیح، مطبوعہ (اردو)
(۴) القدر مطبوعہ (اردو)
(۵) الانہار مطبوعہ (اردو)
(۶) البلاغ مطبوعہ (اردو)
(۷) سبیل الرشاد مطبوعہ (اردو)
(۸) النور مطبوعہ (اردو)
(۹) الخطاب مطبوعہ (اردو)

فارسی شعر و ادب کی تاریخ میں "الانہار" تصنیف کی جس کے بارے میں فارسی و عربی اور اردو کے محقق و ادیب مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے اسے شبلی کے شعر العجم سے بہتر قرار دیا۔ [۴۸]

الحج، حج کے موقع پر تالیف کی اس رسالہ میں حج و زیارت کے تمام ضروری مسائل نہایت سہل زبان و دل نشیں ترتیب میں بیان کئے گئے ہیں اور مقامات حج کا تعارف کرایا گیا ہے۔ مدینہ منورہ کی زیارت کے مسائل بھی قلمبند کئے گئے ہیں اس میں مستند فقہ کی کتابوں کی اصل عبارتیں حوالہ کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں ان عبارتوں اور دعاؤں کا سلیس ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ مولانا کا طرز تحریر اور اسلوب بیان کا اندازہ ان کی اس تحریر سے بخوبی ہوتا ہے۔

> "مکہ معظمہ میں شاید ہی کوئی ایسا مکان ہو جس میں کبوتر نہ رہتا ہو۔ خبردار ہرگز ہرگز نہیں نہ اڑائیے، نہ ڈرائیے، نہ کسی طرح س

> ایذا پہنچاتے۔ سلف سے یہ منقول ہے کہ یہ کبوتر اس مبارک جوڑے کی نسل سے ہیں جس نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت غار ثور میں انڈے دیئے تھے۔ اللہ عزو جل نے اس خدمت کے صلہ میں ان کو اپنے حرم پاک میں جگہ بخشی یہ روایت حرم کے کبوتر کی محبت اور کشش قلبی مومن کے دل میں پیدا کرتی ہے۔"[۴۹]

النور اور سبیل الرشاد میں مولانا نے تحریک خلافت کے لیڈروں کے خلاف شرع اقوال وافعال پر تنقید کی ہے ان میں انہوں نے سہل، سادہ اور عام فہم اردو زبان کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے مولانا فضل حق خیر آبادی کی تصنیف "امتناع النظیر" کو اپنے حاشیہ اور تصحیح کے ساتھ پہلی دفعہ شائع کیا خیر آبادی کی یہ تصنیف فارسی زبان میں ہے جس کو مولوی حیدر علی رام پوری کے اقوال کی تردید میں تحریر کیا۔ سلیمان اشرف کی تصنیفات میں مقبول ترین تصنیف "المبین" ہے جس کے تفصیلی جائزہ حسب ذیل یہ ہے۔

المبین:-

یہ سات ابواب پر مشتمل ہے ان میں حرف کی بحث سے لے کر کمال گویائی تک تمام مدارج ومنازل اور عربی زبان کی فضیلت وعظمت اس خوبی سے بیان کی گئی ہے کہ ہر پڑھنے والا محو حیرت رہ جاتا ہے۔ علم اصول لغت، فلسفہ اور منطق، تعمق نظر اور قوت بحث سے حقائق کو واضح اور منکشف کیا گیا ہے حرف سے لے کر معانی کے فلسفہ تک کے کلام کے تمام مراتب پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا انداز بیان بڑا ہی شگفتہ اور ادیبانہ ہے مصنف نے فارسی اور اردو زبان کے بہترین اشعار کا برمحل اور

برجستہ استعمال کیا ہے۔ اس کتاب کی ابتداء مصنف نے اس مشہور شعر ؎

مشاطه را بگو که بر اسباب حسن یار
چیزے فزوں کند که تماشا بمار سید

سے کی ہے اور آخر تک "چیزے فزوں کند" پر عمل کرتے ہوئے کتاب اس شعر پر ختم ہوتی ہے ؎

تا زیم در غم تو جامه درم
و ز پس مرگ، نوبت کفن است

اس کتاب میں سید سلیمان اشرف نے نہ صرف جرجی زیدان کا جواب دیا ہے بلکہ بہت ایسی مفید بحثیں بھی کتاب میں شامل کر دی ہیں۔ جن کا متقدمین نے صرف اجمالاً اپنی کتابوں میں ذکر کیا تھا۔ مثلاً "فلسفہ اشتقاق" کے بارے میں اشکال ستہ کی ترتیب و مثالیں، متقدمین نے اشتقاق صغیر و کبیر کے قواعد و ضوابط کا ذکر تو کیا ہے لیکن مثالیں بہت کم پیش کی ہیں مگر انہوں نے پوری ۳۰ مثالیں کتاب میں درج کی ہیں جو دس صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں یہ مثالیں عربی زبان کی جامعیت، مصنف کی وسعت مطالعہ اور ذہن رسا کا بین ثبوت ہیں۔

سید سلیمان اشرف کی یہ تصنیف دراصل ایک یہودی مستشرق جرجی زیدان کے مقالہ "فلسفہ الغة العربية" کا رد ہے اس مقالہ میں تحقیق کے نام پر مغالطہ انگیزی سے کام لے کر عربی زبان پر جرجی زیدان نے رکیک حملے کئے تو سید سلیمان اشرف نے اس کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے "المبین" تصنیف فرمائی۔ اس میں دیگر زبانوں کے مقابلے میں عربی زبان کی قدامت و برتری اور اس کے بے مثال محاسن و کمالات نہایت تحقیق کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں زبان و بیان کی دلکشی قاری کو

متاثر کرتی ہے اور وہ کتاب شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔

صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں شروانی و ڈاکٹر اقبال اور مشہور مستشرق پروفیسر براؤن جیسے ناموروں نے اس کتاب کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے چنانچہ پروفیسر براؤن کے لفظوں میں:-

"مولانا نے اس عظیم موضوع پر اردو میں یہ کتاب لکھ کر ستم کیا، عربی یا انگریزی میں ہوتی تو کتاب کا وزن اور وقار بڑھ جاتا۔"[۵۰]

مولانا سید سلیمان اشرف نے المبین کے ایک نسخہ ڈاکٹر اقبال کو بھی بھجوایا تھا اتفاقاً کچھ دن بعد اقبال علی گڑھ گئے تھے تو دوران ملاقات اس کتاب کی بڑی تعریف کی اور اس سے بہت متاثر ہوئے اس ملاقات کا ذکر پروفیسر رشید احمد صدیقی ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

> "المبین شائع ہوئی تو اس کیا ایک نسخہ سر اقبال مرحوم کو بھی بھیجا تھا اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبال مرحوم اپنے لکچروں کے سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہو گئی المبین کا ذکر چھڑ گیا۔ سر اقبال مرحوم نے بڑی تعریف کی اور فرمایا مولانا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن نہیں منتقل ہوا تھا۔ گفتگو ہوتے ہوتے ایک موقع ایسا آیا جب سر اقبال مرحوم نے فرمایا کہ مولانا دوسرے ایڈیشن میں اگر اس بحث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجئے تو بہتر ہو گا۔"[۵۱]

مولانا سید محمد سلیمان اشرف قدس سرہ، اردو کی اہم خدمات انجام دینے کے بعد ۵ ربیع الاول مطابق ۲۵ اپریل (۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء) کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے

اور علی گڑھ شیروانیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ تذکرہ علمائے اہل سنت از محمود احمد قادری ص ۱۰۱ میں تحریر ہے کہ مولانا کا وصال رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ میں ہوا جو مولانا عبدالحکیم شرف قادری (لاہور) کی تحقیق کے مطابق غلط ہے۔ عبدالحکیم شرف قادری نے عبد القدوس ہاشمی کی کتاب "تقویم تاریخی" (ص ۳۴۰) کا حوالہ دے کر تکملہ باغی ہندوستان ص ۴۰۲ میں ۵ ربیع الاول مطابق ۲۵ اپریل (۱۳۵۸ھ / ۹۳۹) تاریخ وصال تحریر کیا ہے جو درست ہے۔

(۱۰)

مولانا مصطفیٰ رضا خاں نوری بریلوی

مولانا مصطفیٰ رضا خان ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء کو بریلی میں پیدا ہوئے ان کا نام محمد رکھا گیا اور عرفی نام مصطفیٰ رضا تجویز کیا گیا۔ نوری تخلص تھا۔ وہ مولانا احمد رضا خان کے چھوٹے صاحبزادے تھے ان کے بڑے بھائی کا نام مولانا حامد رضا خان تھا ان کی پانچ بہنیں تھیں انہوں نے ابتدا میں اپنے بڑے بھائی سے تعلیم حاصل کی اور والد بزرگوار سے علوم دینیہ سیکھا۔ مولانا مصطفیٰ رضا خاں بہت ہی ذہین اور سخت پابند شرع تھے. علوم شریعہ فقہ، تفسیر و حدیث، ادب و منطق و فلسفہ، علم توقیت اور فن تاریخ گوئی میں ان کو نہایت درجہ لیاقت تھی اسی لیے ان کو مفتی اعظم کے خطاب سے نوازا گیا۔

مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے اپنے مسلک کی خوب خوب نشر و اشاعت کی اور اس کے لیے متعدد تحریکات کا مقابلہ کیا اور نمایاں خدمات انجام دیں اس سلسلے کی چند

تحریکات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ان تحریکوں میں کارکردگی سے مصطفیٰ رضا خاں کی سیاسی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

تقریباً ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں مولانا احمد رضا نے "انصار الاسلام" قائم کی جن کا مقصد حمایت خلافت و حفاظت سلطنت اسلامی تھی، مظلومین ترک کی اعانت کے لیے عملاً اقدام کرنا اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ جماعت انصار لاسلام کے ناظم اعلیٰ مولانا حسنین رضا (برادر عم زاد مولانا احمد رضا بریلوی) تھے۔ عالم شباب میں مولانا مصطفیٰ رضا خاں اس کے رکن رکین تھے۔ انصار الاسلام کے ایک جلسہ کی قرار داد کے چند نکات ملاحظہ ہوں، اس سے اندازہ ہوگا کہ عنفوان شباب ہی سے مولانا کس نوعیت کی سیاست کے قائل اور عامل تھے اور مسلمانوں کے لیئے ان کے دل میں کسقدر ہمدردی اور اصلاح کا جذبہ موجود تھا اس کے سبب انہوں نے حفاظت مقامات مقدسہ اور مظلومین ترک کی امداد و اعانت کی بھرپور کوشش کی۔

جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی ۵ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ / ۱۷ دسمبر ۱۹۲۰ء کو قائم ہوئی اس کے مقاصد یہ تھے۔

(ا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و عظمت کا تحفظ۔

(ب) متحدہ قومیت کا نعرہ بلند کرنے والے فرقہ گاندھویہ کا تحریری و تقریری رد کرنا۔

(ج) بدمذھبوں کی چیرہ دستیوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا۔

(د) آریہ اور عیسائیوں کے اعتراضات کے تحریری و تقریری جوابات دینا۔

(ہ) مولانا احمد رضا اور دوسرے علمائے اہل سنت کی تصنیفوں کی اشاعت، غیر اسلامی نظریہ متحدہ قومیت کے ہیجانی دور میں اسلامی تشخص کے امتیازات کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کرنا اور شعائر اسلامی کا تحفظ۔

فتنہ ارتداد کے انسداد اور عوام میں راسخ الاعتقادی پیدا کرنے میں جماعت رضائے مصطفیٰ نے مثالی اور موثر کام کیا۔ مولانا مصطفیٰ رضا خاں اس کے رکن رکین تھے اس جماعت کے ساتھ منسلک رہ کر مولانا نے اشاعت و تبلیغ اسلام اور تحریک آزادی کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء میں شردھانند کے فتنہ ارتداد کا مقابلہ کیا اور تبلیغی مشن میں مصروف رہے۔ ۱۳۶۶ھ / اپریل ۱۹۴۶ء میں تحریک آزادی کی حمایت کے سلسلے میں آل انڈیا سنی کانفرنس (جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ) کے اجلاس میں شریک ہوئے اور اسلامی حکومت کے لائحہ عمل کی تشکیل کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے اہم رکن تھے مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے پانچ لاکھ ہندوؤں کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا۔

اپنے والد ماجد مولانا احمد رضا خان کی اہم تصنیف "دوام العیش فی الائمہ من قریش" جو خلافت شرعیہ سے متعلق تھی، انہوں نے اس پر ایک اہم دیباچہ کا اضافہ کر کے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ تحریک ترک موالات ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء کے دور میں گاندھی جی کے ساتھ بڑے بڑے مسلمان لیڈر اور علماء بھی پیش پیش رہے۔ وہ ان کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ ترک موالات کے دور میں انگریزوں سے ہر قسم کا قطع تعلق روا رکھا گیا جب کہ ہندو قوم سے اتحاد و وداد کی باتیں ہونے لگیں حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دونوں غیر مسلم ایک جیسے سلوک کے مستحق تھے مگر جذبات کی سیاست نے معاملہ الٹ دیا۔ اسی دور میں مولانا احمد رضا اور ان کے ہم نوا عالموں اور دانشوروں نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ مسلمان بحیثیت مسلمان قوم کے ہر دوسری قوم سے ممتاز ہے کسی دوسری قوم سے اس کا اتحاد و وداد ممکن نہیں اور نہ شرعی طور پر جائز ہے۔ اسلامی تشخص کا تحفظ اور اس کو نکھارنے میں مولانا مصطفیٰ رضا خان نے مثالی کردار ادا کیا۔

۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں سکھوں نے انگریز حکام کی پشت پناہی میں لاہور کی

مسجد شہید گنج کو مسمار کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ جگہ اور عمارت گوردوارا کی ہے۔ مسلمانوں نے اسے قبضہ کر رکھا ہے۔ مسجد کے انہدام پر مسلمانوں نے تحریک کا آغاز کر دیا جلسے اور جلوسوں کا بازار گرم ہوا۔ مجلس احرار ہند نے مسلمانوں کی اجتماعی مساعی میں نہ صرف عدم شرکت کی بلکہ اس خالص اسلامی تحریک کی مخالفت کی اور اس تحریک میں حصہ لینا ناجائز قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو مسلمان اس تحریک میں جان دے گا ان کی موت حرام ہوگی وہ شہید نہیں۔ ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ / ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء کو مسجد شہید گنج کی بازیابی کے ضمن میں ہلاک ہونے اور تحریک میں حصہ لینے والوں کی شرعی حیثیت سے متعلق ایک استفتاء مولانا مصطفیٰ رضا خان کے پاس لایا گیا انہوں نے نہایت تفصیل سے شرعی دلیلوں سے ثابت کیا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس تحریک میں حصہ لے کر مسجد کو سکھوں سے آزاد کرائیں اور جو لوگ اس تحریک میں جان کی قربانی دیں گے وہ شہید ہیں۔

۲۰ ویں صدی کے اوائل میں اشتراکیت کا فتنہ روس سے پیدا ہوا ۱۹۳۵ء کے انتخاب میں کانگریسی لیڈروں نے اشتراکیت کی اشاعت کی اور اسے ہندوستانیوں کی مشکلات کا حل بتایا۔ یو۔پی وغیرہ صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے اشتراکیت کے بہروپ میں ناقابل برداشت مظالم ڈھائے ان مظالم کا نشانہ مسلمان تھے۔ ۲ محرم ۱۳۵۷ھ / ۵ مارچ ۱۹۳۸ء کو ایک مدلل و مبسوط فتویٰ کی صورت میں مولانا مصطفیٰ رضا خان نے اشتراکیت کے بے خدا نظام کی خامیوں کو اجاگر کیا اور اس دہریانہ نظام کے مخترعین کی بے عقلیوں اور کوتاہ بینی کو دلائل سے واضح کیا۔

برصغیر میں ۲۰ ویں صدی کے ربع اول ہی میں استخلاص وطن کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ربع ثانی میں یہ تحریکیں اپنے عروج پر تھیں مگر ان تحریکوں میں بعض اس قسم کے طریقے وضع ہوئے اور ان پر عمل بھی ہونے لگا جس کا نتیجہ مسلمانوں کی ہمیشہ کی

ہندوؤں کی غلامی مقدر ہو جاتی۔ علمائے اہل سنت کا موقف یہ تھا کہ وطن کی آزادی کے بعد مسلمان بھی آزاد ہوں۔ انہیں ہندوؤں کی سرپرستی اور غلامی سے بھی چھٹکارا ملنا چاہیے۔ اس کے لیے کانگریس اور کانگریسی مسلمان لیڈر تیار نہ تھے بلکہ ان کی مخالفت کافی بڑھ گئی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کے معاشرتی، تجارتی، معاشی، تمدنی، تعلیمی اور سیاسی حقوق کو ہندوؤں پر قربان کیا جانے لگا اس بگڑی ہوئی صورتِ حال کے پیش نظر علمائے اہل سنت نے کل ہند سنی کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۵ء میں مراد آباد میں اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کانفرنس کی شاخیں پورے ہندوستان میں قائم ہو گئیں۔ مولانا مصطفیٰ رضا خاں اس کانفرنس کے مرکزی سرپرست تھے۔ ان کی سربراہی اور رہنمائی میں آل انڈیا سنی کانفرنس نے برصغیر کی سیاست میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔

وائسرائے ہند لارڈ ویول نے شملہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کرانے کے لیے ایک کانفرنس کی۔ مسلم لیگ کا موقف تھا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی تنظیم ہے جب کہ کانگریس متحدہ ہندوستان کے پورے باشندوں کی نمائندگی کی دعوے دار تھی۔ مولانا مصطفیٰ رضا خان نے قائد اعظم پاکستان (محمد علی جناح) کے نام ایک تار میں مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی حمایت کی مولانا کا یہ تار روزنامہ انجام دہلی مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۴۵ء میں بھی شائع ہوا۔

۱۹۴۵ / ۴۶ء کے برصغیر کے مرکزی اور صوبائی انتخابات تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انہیں انتخابات کے نتیجہ میں برصغیر کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا استخلاص وطن کے ساتھ اسلامی ریاست کا قیام انہیں انتخابات کا مرہونِ منت تھا اس صورت حال میں علماء و مشائخ اہل سنت نے مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم مسلم لیگ کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اس کے لیے علماء نے باقاعدہ فتویٰ جاری کئے ان

فتاوی پر مولانا مصطفیٰ رضا خاں اور ان کے تلمیذ رشید شیخ الحدیث علامہ سردار احمد خاں صاحب کے دستخط مہر ثبت ہوتے۔

آل انڈیا سنی کانفرنس کا ایک عظیم اجلاس ۲۴ تا ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ / ۲۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو بنارس میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں پانچ سو اہل سنت کے مشائخ، سات ہزار علما اور دو لاکھ سے زیادہ اہل سنت کے عوام شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے مرکزی کردار ادا کیا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کانفرنس کی طرف سے جو مختلف کمیٹیاں بنائیں ان میں سے بعض کی سربراہی مولانا نے قبول کی۔ جن مجالس میں ان کا انتخاب ہوا وہ یہ ہیں:

تعلیم، پاکستان، دارالقضاء، ملکی قوانین، جمعیت آئین ساز وغیرہ۔

کانگریسی حکومت ہند نے غیر منصفانہ طور پر اہل سنت کے اداروں اور اوقاف پر غیر سنیوں کو بالادستی کا حق دے دیا۔ ۱۹۶۰ء میں حکومت ہند نے ایک وقف ایکٹ کے ذریعہ اہل سنت کے حقوق پامال کرنے کی کوشش کی، نیز مسلمانوں کے مذہبی اداروں کا اسلامی تشخص اور امتیاز ختم کرنے کی سازش کی اور مختلف صوبوں میں مسلمانوں کے مذہبی مقامات مساجد و مزارات کو چھیننے کی کوشش کی کے سدباب کے اس لیے مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی نے تمام علماء و مشائخ کو جمع کیا اور دسمبر ۱۹۶۱ء آل انڈیا سنی اوقاف کانفرنس دہلی میں منعقد کی اس میں ڈیڑھ لاکھ افراد نے شرکت کی۔ یہ کانفرنس بڑی کامیاب ثابت ہوئی وزیر اعظم ہند اور دیگر صاحبان اقتدار نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور مسلمانوں کے مطالبات کو غور سے سنا اور اس پر عمل کیا اس طرح اہل سنت کے مذہبی ادارے اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھ سکے اور مسلمانوں کی مشہور [illegible] یونیورسٹی علی گڑھ بھی [illegible] حکومت سے [illegible] رہی۔

اس کانفرنس کی کامیابی کے بعد مولانا مصطفیٰ رضا خان صاحب کی سرپرستی میں

جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی نے کل ہند تعلیمی تنظیمی کانفرنس، دہلی کے ذریعہ ہندوستان کے تمام سنی اداروں اور مدرسوں کو مربوط کرنے کی کوشش شروع کی۔ ملک کے گوشے گوشے کا دورہ کرنے اور ان اداروں کے تفصیلی کوائف مرتب کرنے کے لیے ایک وفد ترتیب دیا گیا۔

۱۳۵۸ھ میں مسجد بی بی مرحومہ، بریلی میں دارالعلوم مظہر اسلام مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی کی سرپرستی میں قائم ہوا ان کے تلمیذ رشید شیخ الحدیث علامہ سردار احمد صاحب اس دارالعلوم کے منتظم اور شیخ الحدیث تھے۔ تقسیم ہند کے بعد شیخ الحدیث صاحب پاکستان چلے گئے اس وقت دارالعلوم کی کوئی مستقل عمارت نہ تھی۔ مسجد کے صحن اور حجرے طلبا اور اساتذہ کی رہائش گاہ تھی اور مسجد کا صحن درس گاہ تھا۔ اس ادارہ نے تعلیمی اور روحانی خدمات سرانجام دیں اس کے بعد ایک رضا لائبریری اور باہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے ایک رضا گیسٹ ہاؤس کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے اس کے لیے تحریک شروع کر دی۔ جگہ کے تعین کا کام سب سے مشکل تھا لیکن ۱۹۶۲ء سے اس کے لیے کوشش شروع کر دی گئی۔ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کی تعمیری کمیٹی کو اس عظیم منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا کام سونپا گیا۔

جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی اس وقت اس کی حیثیت ایک مقامی جمعیت کی تھی اس جمعیت کے دو بڑے شعبے تھے۔ علمی و عملی۔ اس جمعیت نے دونوں پہلوؤں پر تاریخ ساز کردار سرانجام دیا لوگوں میں مقبول ہو کر اس کی ایک مرکزی حیثیت ہو گئی اور پورے برصغیر میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اس بنیاد پر وقتاً وقتاً اس کے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط میں ترمیم و اضافہ ہوتا رہا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ۱۴ جمادی الاول ۱۳۸۳ھ / ۱۳ اکتوبر

۱۹۶۳ء کو مولانا مصطفیٰ رضا خاں کی سرپرستی میں مولانا برہان الحق جبل پوری (خلیفہ مولانا احمد رضا) کے یہاں کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں حسب ذیل دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

(۱) کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کی دائمی سرپرستی مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی فرمائیں گے۔ (۲) کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ سارے ہندوستان کی کل مقامی ضلعی، صوبائی اور کل ہند جملہ سنی تنظیموں کی نگراں اور جماعت ہوگی۔ ہندوستان کی ساری سنی تنظیمیں اور جماعتیں کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کے تحت رہیں گی۔ (۳) مختلف سنی تنظیموں کے باہمی اختلاف کی شکل میں کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کی حیثیت ثالث اور حکم کی ہوگی۔ (۴) کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کی جماعت کی تنظیم حسب ذیل ہوگی۔

(ا) ہر شہر میں دار الافتاء قائم کرنا

(ب) ہر شہر میں دار القضاء قائم کرنا

(ج) ہر جگہ مکاتب و مدارس اسلامیہ قائم کرنا

(د) ہندوستان کے ہر شہر کے مفتی اور قاضی کا براہ راست تعلق کل ہند رضائے مصطفیٰ سے ہوگا۔

مسلمانوں کی قومی و مذہبی نزاعات کے فیصلے کے لیے قاضی کی شرعی ضرورت چونکہ ہندوستان کی موجودہ سیکولر نظام حکومت میں ممکن نہ تھی لہٰذا اس اہم ضرورت کو جماعت رضائے مصطفیٰ کی مرکزی حیثیت پورا کرے گی۔ (۵) کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کا مرکزی دفتر بریلی ہی میں زیر نگرانی مولانا مصطفیٰ رضا خاں رہے گا۔ (۶) ریلیف کمیٹی، مرکزی جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کی نگرانی، ترمیم اور تبدیلی کے

کل اختیارات سرپرست و صدر کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کو حاصل رہیں گے۔

جبل پور کے اس کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کے خصوصی اجلاس سے قبل ولانا احمد رضا کے عرس کے موقع پر ۲۶ صفر ۱۳۸۳ھ / ۱۸ جولائی ۱۹۶۳ء کو کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کا مرکزی انتخاب عمل میں لایا گیا جس میں مولانا برہان الحق جبل پوری کو کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کا صدر اور جناب مولانا ابو الوفا فصیحی ازی پوری کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا جا چکا تھا اب اس جبل پور کے اجلاس میں بقیہ ہدیداران کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا۔ نائب صدر اول جناب مولانا سید محمد دنی کچھوچھوی، نائب صدر دوم جناب مولانا رفاقت حسین احسن المدارس کان پور، اظم مولانا محمد دھوراجی (راج پیلا بھروچ، گجرات)، نائب ناظم جناب عبد الصمد جنوں، جبل پور، نائب ناظم و خازن سید حمایت رسول (نزد جامع مسجد بریلی) اس کے لاوہ متعدد علمائے کرام کو کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر امزد کیا گیا۔

اس طرح مولانا مصطفیٰ رضا خان کی سرپرستی میں جماعت رضائے مصطفیٰ کی نشاۃ ثانیہ نے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی و قومی اسلامی ضرورت کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

ہندوستان کی سیکولر حکومت اپنے دعویٰ لادینیت پر قائم نہ رہی۔ کانگریس کے مائندگان کی حکومت نے غیر جانبداری کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ہندوستان کے سلمانوں کی دینی، اقتصادی، لسانی اور سیاسی حقوق کی پامالی کے واقعات اس قدر عام ہوگئے کہ ایثار کا جذبہ رکھنے والے علماء نے محسوس کیا کہ ان کی ایک کل ہند مرکزی و سیاسی تنظیم ہو جو مسلمانوں کے ہر قسم کے حقوق کی حفاظت کا فریضہ سر نجام دے۔ چنانچہ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۳ھ / نومبر ۱۹۶۳ء کو آل انڈیا سنی جمعیتہ

العلماء کانفرنس کا عظیم اجتماع کان پور میں ہونا متعین پایا۔ اس کانفرنس کی
پرستی مولانا مصطفیٰ رضا خان نے فرمائی۔

حکومت کے چند دوسرے ایسے اقدامات کی بھی کھل کر مخالفت کی
مذہب اسلام کے منافی تھے۔ حکومت کی طرف سے نافذ نسبندی کے خلاف
مصطفیٰ رضا بریلوی نے قلم اٹھایا اور بے باکی اور حق گوئی سے کام لیتے ہوئے
جاری کیا کہ نسبندی حرام ہے، حرام ہے، حرام ہے۔ اس فتوی کے خلاف
گرفتاری کی صورت حال پیدا ہو گئی مگر ملک میں ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے
مرکزی حکومت (اس وقت اندرا گاندھی کی حکومت تھی) نے مداخلت کر
کلکٹر کو اس فعل سے باز رہنے کی تلقین کی چونکہ ان کی گرفتاری سے پورے ملک
تشدد کا اندیشہ تھا پھر مفتی مصطفیٰ رضا صاحب خود اپنا فتوی واپس نہیں لیں گے
صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد نرمی برتی گئی اور جبری نس بندی کا نفاذ مسلمانوں
کے لیے روک دیا گیا یہ مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی کی بڑی کامیابی تھی جس کا
ان کی خودداری اور خود اعتمادی کے سر ہے۔ غیرت دینی کا یہ عالم تھا کہ بانوے بر
کی طویل عمر میں کبھی کسی سربراہ مملکت کے ہاں ان کو نہیں دیکھا گیا۔ اور نہ بڑے
بڑے فرمانرواؤں کے بنگلوں میں نظر آتے۔

مولانا مصطفیٰ رضا خان کی فتوی نویسی اور فقہی بصیرت

۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں جب مولانا مصطفیٰ رضا خان کی عمر ۱۸ سال تھی وہ کس
کام سے رضوی دار الافتاء میں پہنچے تو وہاں مولانا ظفر الدین بہاری اور مولانا سید عب
الرشید عظیم آبادی فتوی لکھنے کے لیے رضاعت کے کسی مسئلہ پر تبادلہ خیال کر

رہے تھے مسئلہ کے سلسلہ میں بات کچھ الجھی تو مولانا ظفر الدین صاحب "فتاوی رضویہ" الماری سے نکالنے کے لیے اٹھے تاکہ اس سے فائدہ حاصل کریں اتنے میں مولانا مصطفی رضا خان نے کہا کہ فتاوی رضویہ دیکھ کر جواب لکھتے ہو؟ تو مولانا ظفر الدین صاحب نے فرمایا اچھا تم بغیر دیکھے لکھ دو تو جانوں اتنا کہنا تھا کہ مولانا مصطفیٰ رضا خان نے فورا یہ فتوی لکھ دیا مولانا خود فرماتے ہیں:-

> "نو عمری کا زمانہ تھا میں نے کہا فتاوی رضویہ دیکھ کر جواب لکھتے ہو؟ مولانا نے فرمایا! اچھا تم بغیر دیکھے لکھ دو تو جانوں میں نے فورا لکھ دیا وہ رضاعت کا مسئلہ تھا" ۵۲

جب مسئلہ رضاعت کا فتوی اصلاح کے لیے مولانا احمد رضا خاں قدس سرہ کو پیش کیا گیا تو مولانا فاضل بریلوی نے فتوی کا خط پہچان لیا انہوں نے دریافت کیا کہ یہ کس نے دیا ہے؟ حامل فتوی نے بتایا کہ "چھوٹے میاں" نے (گھر میں لوگ پیار میں مولانا مصطفیٰ رضا صاحب کو چھوٹے میاں کہتے تھے) ان کو مولانا احمد رضا خان نے بلایا وہ حاضر ہوتے تو انہوں نے فاضل بریلوی کو خوش دیکھا اور فرمایا کہ اس پر دستخط کرو۔ دستخط کروانے کے بعد مولانا احمد رضا خان نے "صحیح الجواب بعون اللہ العزیز الوہاب" لکھ کر اپنے دستخط کئے۔ اس طرح اگر ایک طرف مولانا مصطفیٰ رضا کو رضوی دار الافتاء کے مفتیوں پر سبقت حاصل ہو گئی تو دوسری طرف مولانا احمد رضا بریلوی کی طرف سے فتوی نویسی کی باقاعدہ اجازت مل گئی چھوٹی عمر میں انہیں یہ بڑا اعزاز حاصل ہوا۔

مولانا مصطفیٰ رضا خاں کے اس طرح فتوی نویسی کے آغاز پر مولانا احمد رضا خاں نے اپنے صاحب زادے کو پانچ روپئے بطور انعام دے کر کہا۔

> "تمہاری مہر بنوا دیتا ہوں۔ اب فتوی لکھا کرو۔ اپنا ایک رجسٹر

بنالو۔ اس میں نقل بھی کیا کرو۔"[۵۳]

مولانا احمد رضا نے اپنے ہاتھ سے مہر کا خاکہ تیار کیا جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔ "ابو البرکات محی الدین جیلانی، آل رحمٰن، عرف مصطفیٰ رضا"[۵۴] پھر اسے مولانا حافظ یقین الدین بریلوی کے بھائی کے حوالہ کیا۔ جب مہر بن کر آگئی تو اسے اپنے صاحبزادے مصطفیٰ رضا کو بلا کر دے دیا، یہ مہر دینی شعور کی سند تھی۔

مولانا مصطفیٰ رضا خان صاحب دارالافتاء میں مولانا ظفر الدین بہاری، مولانا امجد علی اعظمی اور مولانا برہان الحق جبل پوری کے رفیق رہے اور فتویٰ نویسی میں وہ کمال پیدا کیا کہ پھر آپ کی نگرانی میں بیسیوں عالموں نے فتویٰ نویسی کی مشق کی اور مفتی بنے۔ ان کے فتاوے کی دو جلدیں مسمّیٰ بہ "فتاویٰ مصطفویہ" شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا رضا بریلوی کو اپنے لائق صاحبزادے کے فقاہت اور ثقاہت پر بڑا ناز تھا۔ اعتماد کا یہ عالم تھا کہ اپنے بعض فتووں پر ان کے تائیدی دستخط تک کرا لیتے تھے۔ مولانا احمد رضا قدس سرہٗ نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مسائل مولانا مصطفیٰ رضا سے لکھوائے اور ان کی تصدیق و تصویب فرما کر اپنے دستخط کرتے تھے۔

رجب ۱۳۳۹ھ میں مولانا احمد رضا نے متحدہ ہندوستان کے لیے "دارالقضاء شرعی" قائم کیا۔ اور بعض علماء کی موجودگی میں مولانا امجد علی اعظمی اور مولانا مصطفیٰ رضا کو افتاء اور قضا کے منصب پر مامور کیا۔ آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس کے اجلاس کی مجلس سوم میں ۲۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو بوقت ۹ بجے صبح تا ایک بجے دوپہر اندرون باغ فاطمان میں جو ۲۱ تجاویز باتفاق رائے منظور ہوئیں ان میں تجاویز نمبر ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲ اور ۱۳ ملاحظہ ہوں۔

(۹) آل انڈیا سنی کانفرنس کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ بریلی میں مولانا مصطفیٰ رضا خان کے زیر قیادت ایک مرکزی دارالافتاء کا انتظام کیا جائے جس میں کم سے کم

چار جید عالموں کی خدمات حاصل کی جائیں اور مولانا امجد علی اعظمی اس کی سرپرستی و نگرانی فرمائیں۔ (۱۰) ملک کے کسی مقام پر جس کسی فتوے میں تردد یا اختلاف ہو آخری حکم معلوم کرنے کے لیے اس دار الافتاء میں بھیجا جائے دینی و مذہبی رسائل چھپنے سے پہلے یہاں بھیج کر تصدیق و تصحیح بھی کرائی جا سکتی ہے اس طرح مذہبی نظام انتشار و اختلاف سے محفوظ رہے گا۔ (۱۱) اس دار الافتاء کے مصارف کے لیے اسلامی ریاستوں سے اور اہل ثروت مسلمانوں سے امدادیں طلب کی جائیں۔ (۱۲) اسلامی مدارس اس دار الافتاء کے لیے حسب حیثیت ماہانے مقرر کریں (۱۳) خانقاہوں کے اوقاف سے اعانتیں مقرر کرائی جائیں۔

مولانا مصطفیٰ رضا خاں جب حج بیت اللہ کے لیے گئے تو حجاز، مصر، شام، عراق، اور ترکی وغیرہ کے عالموں نے ان سے مسائل دریافت کیے۔ اس کے علاوہ ان کے ن عرب، افریقہ، ماریشس، انگلینڈ، امریکہ، سری لنکا، ملیشیا، بنگلہ دیش، اور پاکستان سے استفتاء آتے اور انہوں نے ان کے جوابات لکھے۔

رؤیت ہلال سے متعلق استفتاء کا جواب

جنرل محمد ایوب خاں سابق صدر پاکستان کے دور میں پاکستانی حکومت کی طرف سے ایک رؤیت ہلال کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے ذمہ عیدین کے موقعوں پر ہوائی جہاز کے ذریعہ چاند دیکھنا تھا اور پھر رؤیت ہلال کمیٹی کی تصدیق پر حکومت کی جانب سے چاند کی رؤیت کا اعلان کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر ۲۹ رمضان کو اس کمیٹی کے کچھ افراد ہوائی جہاز کے ذریعہ چاند دیکھنے گئے، مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) سے مغربی پاکستان جاتے ہوئے ان افراد کو چاند نظر آگیا اور انہوں نے

اس کی اطلاع حکومتِ وقت کو دے دی۔ جس کے نتیجہ میں حکومتِ پاکستان نے رویت ہلال کا اعلان کر دیا مگر پاکستان کے سنی علماء نے اس پر اعتماد نہ کیا۔ دنیائے اسلام کے بیشتر ملکوں میں مفتیان کرام سے اس مسئلہ میں فتویٰ مانگا گیا اور ایک استفتاء مولانا مصطفیٰ رضا صاحب کے پاس بھیجا گیا دنیا کے تقریباً تمام مفتیوں نے رویت ہلال کمیٹی کی تائید [illegible] سے نہیں۔ [illegible]نا اور علاحدہ سے یہ فتویٰ صادر کیا کہ

> "چاند زمین سے دیکھ کر روزہ رکھنے اور عید کرنے کا شرعی حکم ہے اور جہاں چاند نظر نہ آئے وہاں شرعی شہادت پر قاضی شرع حکم دے گا۔ چاند کو سطح زمین سے یا ایسی جگہ سے جو زمین سے ملی ہو وہاں سے دیکھنا چاہیے۔ رہا جہاز سے چاند دیکھنا تو یہ غلط ہے، کیوں کہ چاند غروب ہوتا ہے فنا نہیں ہوتا اس لیے کہیں چاند ۲۹ اکتوبر کو اور کہیں ۳۰ کو نظر آتا ہے۔ اور اگر جہاز میں چاند دیکھ کر رویت کا اعلان درست ہو تو مزید بلندی پر جا کر چاند ۲۷، ۲۸ تاریخ کو بھی نظر آسکتا ہے تو کیا ۲۷، ۲۸ تاریخ کو چاند دیکھ کر یہ حکم صادر کیا جاسکتا ہے کہ اگلے روز عید یا بقر عید جائز ہے اسی طرح جہاز سے چاند دیکھ کر یہ فتویٰ صادر کرنا کہ ۲۹ کا چاند دیکھنا معتبر ہے بھلا کس طرح صحیح ہو گا۔
>
> فقیر مصطفیٰ رضا قادری غفرلہ" ۵۵

ان کے اس فتوے کو پاکستان کے ہر اخبار میں جلی سرخیوں سے شائع کیا گیا۔ حکومت پاکستان نے اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے ہلال کمیٹی کو توڑ دیا اور ہوائی جہاز کے ذریعہ چاند دیکھنے کا سلسلہ منسوخ کر دیا گیا۔

مولانا مصطفیٰ رضا خان نے اپنے والد ماجد کی زندگی میں ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء سے

۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء تک فتاوے لکھے۔ والد ماجد کے وصال کے بعد ۱۳۹۵ھ تک مسلسل فتوی نویسی کی۔ اس کے بعد ضعف و علالت کی وجہ سے فتوی نویسی کا کام نہ ہو سکا تاہم آخری لمحات تک مفتیان دین کی علمی مشکلات کو زبانی حل کرتے رہے اس طرح ۷۰ سال کے طویل عرصہ تک بلا معاوضہ فتوی نویسی کی خدمت انجام دی۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اردو کے علاوہ عربی و فارسی زبان میں بھی فتوی صادر فرماتے تھے۔ مولانا مصطفیٰ رضا کے فتاوے لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ڈاکٹر فیضان علی رضوی نے صرف ۱۳۴۹ھ سے ۱۳۵۹ھ تک دس گیارہ سال کے فتاوے کی نقل اصل رجسٹر سے دو جلدوں میں "فتاوی مصطفویہ" کے نام سے شائع کرایا۔ پہلی جلد میں کتاب الایمان اور دوسری جلد میں کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ اور احکام مسجد درج ہیں۔ باقی ان کے تمام فتاوے غیر مطبوعہ ہیں۔

تصنیف و تالیف:-

درس و تدریس کے علاوہ مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ کی اور مذہبیات و سیاسیات دونوں پر قلم اٹھایا۔ سیاسیات سے متعلق مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا احمد رضا بریلوی کے درمیان مراسلات کو الطاری الداری کے نام سے تین حصوں میں مرتب کر کے مؤرخین کے لیے ایک تاریخی دستاویز مہیا کر دی۔ مولانا مصطفیٰ رضا نے تقریبا پچاس سے زائد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جس میں کچھ قلمی ہیں اور زیادہ تر چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

مولانا صاحب کو تمام علوم اسلامیہ، معقول و منقول وغیرہ میں مہارت تامہ حاصل تھی تاہم تذکرہ نویسوں نے ۳۰ علوم کی فہرست پیش کی ہے۔ جن کی جھلک ان

کی تصنیفات میں نظر آتی ہے۔ ان کی جن تصانیف کا پتہ مجھے چل سکا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱ ---اشد الباس علی عابد الخناس ۱۳۲۸ھ (اردو)
۲ ---الکاوی فی العاوی و الغاوی ۱۳۳۰ھ (اردو)
۳ ---القثم القاصم للداسم القاسم ۱۳۳۰ھ (اردو)
۴ ---نور الفرقان بین جند الالٰہ و احزاب الشیطان ۱۳۳۰ھ (اردو)
۵ ---وقعات السنان فی حلقة مسماة بسط البنان ۱۳۳۰ھ (اردو)
۶ ---الرمح الدیانی علی راس الوسواس الشیطانی ۱۳۳۱ھ (اردو)
۷ ---وقایہ اہل سنتہ عن مکر دیو بند و الفتنہ ۱۳۳۲ھ (اردو)
۸ ---الہی ضرب بہ اہل الحرب ۱۳۳۲ھ (اردو)
۹ ---ادخال السنان الی الحنک الحلقی بسط البنان ۱۳۳۲ھ (اردو)
۱۰ --نہایت السنان ۱۳۳۲ھ (اردو)
۱۱ --صلیم الیدان لتقطیع حبالة الشیطان ۱۳۳۲ھ (اردو)
۱۲ --سیف القہار علی العبد الکفار ۱۳۳۲ھ (اردو)
۱۳ --نفی العار من معائب المولوی عبد الغفار ۱۳۳۲ھ (اردو)
۱۴ --النکتہ علی مرأة کلکتہ ۱۳۳۲ھ (اردو)
۱۵ --مقتل کذب و کید ۱۳۳۲ھ (اردو)
۱۶ --مقتل الکذب و اجہل ۱۳۳۲ھ (اردو)
۱۷ --الموت الاحمر علی کل الجنس الکفر ۱۳۳۷ھ (اردو)
۱۸ -ملفوظات اعلیٰ حضرت (چار حصص) ۱۳۳۸ھ (اردو)
۱۹ --الطاری الداری لہفوات عبد الباری (تین حصص) ۱۳۳۹ھ (اردو)

۲۰ -- القول العجیب فی جواز التثویب ۱۳۳۹ھ (اردو)

۲۱ -- طرق الہدی والارشاد فی احکام الامارۃ والجہاد ۱۳۴۱ھ (اردو)

۲۲ -- حجۃ واہرہ بوجوب الحجۃ الحاضرہ ۱۳۴۲ھ (اردو)

۲۳ -- القسورہ علی ادوار الحمر الکفرہ ۱۳۴۳ھ (اردو)

۲۴ -- سامان بخشش عرف گلستان نعت نوری مطبوعہ دلی ۱۳۵۴ھ (اردو، مجموعہ کلام)

۲۵ -- فتاوی مصطفویہ (دو حصص) از ۱۳۴۹ھ تا ۱۳۵۹ھ (اردو)

۲۶ -- شفاء العی فی جواب سوال بمبئی (اردو)

۲۷ -- تنویر الحجہ بالتواء الحجہ (اردو)

۲۸ - وہابیہ کی تقیہ بازی (اردو)

۲۹ -- مسائل سماع (اردو)

۳۰ -- الحجۃ الباہرہ (اردو)

۳۱ -- نور العرفان (اردو)

۳۲ -- داڑھی کا مسئلہ (اردو)

۳۳ -- ہشتاد بید و بند بر مکال دیوبند (اردو)

۳۴ -- طرد الشیطان (اردو)

۳۵ -- سلک مراد آباد پر معترضانہ ریمارک (اردو)

۳۶ -- سل الحسام الہندی لنصرۃ سیدنا خالد النقشبندی (اردو)

۳۷ -- کانگریسیوں کا رد (اردو)

۳۸ - کشف ضلال دیوبند (اردو)

۳۹ -- حاشیہ فتاوی رضویہ جلد اول (اردو)

۴۰ -- ترتیب فتاوی رضویہ جلد دوم

۴۱-- حاشیہ فتاوی رضویہ جلد سوم (اردو)

۴۲-- حاشیہ فتاوی رضویہ جلد چہارم (اردو)

۴۳-- حاشیہ تفسیر احمدی (قلمی)

۴۴-- حاشیہ فتاوی عزیزیہ (قلمی)

۴۵-- حاشیہ وشرح الاستناد علی اجیال الارتداد مطبوعہ [illegible] عالم پریس۔ لاہور (اردو)

نوٹ:- بعض محققین کے مطابق ترتیب نمبر ۳۸ پر رقم شدہ کتاب کشف ضلال دیوبند علیحدہ تصنیف نہیں بلکہ اس حاشیہ کا عنوان ہے۔ تحریر پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی بحوالہ "مفتی اعظم اور ان کے خلفاء" حاشیہ ۳ صفحہ ۱۰۰

مولانا مصطفیٰ رضا صاحب کی تمام تصنیفات و تالیفات ان کی علمیت و صلاحیت اور فقہی بصیرت و ژرف نگاہی کے منہ بولتے شاہکار ہیں۔ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات و مشاغل کے باوجود مختلف موضوعات پر تصنیفات و تالیفات کا ایک گرانقدر ذخیرہ چھوڑا ہے۔ زبان [illegible] استعمال کرتے ہیں، الفاظ برمحل لاتے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے۔ ان کی بعض اہم کتابوں کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے جنہیں دوسری کتابوں کو رد کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

وقعات السنان:-

یہ کتاب [illegible] میں مکمل کی گئی یہ مطبع [illegible] پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپی تھی۔ اس میں مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کی کتاب "بسط البنان" پر اور مولوی قاسم نانوتوی کی "تحذیر الناس" پر بھرپور تنقید کی گئی ہے۔ اس کے اندر تھانوی صاحب اور ان کے ہم خیالوں سے ایک سو تیس سوالات کیے گئے ہیں یہ سوالات کتاب الکاوی فی العاوی والغاوی اور القسم قاصم [illegible] اسم القاسم ورا [illegible] باس علی عابد الخناس

(جو تحذیر الناس کا رد ہے) اور نور الفرقان بین جند الالٰہ واحزاب الشیطان وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔ یہ سوالات مسلک دیوبند پر کیے گئے ہیں۔ اس کا انداز سوال ملاحظہ ہو:-

سوال نمبر ۱۔ "محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خاتم النبین ہونا جو قرآن عظیم میں منصوص اور مسلمانوں کے ضروریات دین سے ہے صرف یہ لفظ ضروریات سے ہے معنی کچھ مراد نہ سمجھئے یا ان کے کوئی معنی ضروریات سے ہیں بر تقدیر ثانی وہ معنی کیا ہیں۔"

یہ مجموعہ سوالات رجسٹری کے ذریعہ تھانوی صاحب کے پاس بھیجا گیا جس کا جواب نہ آسکا۔

الموت الاحمر:-

یہ کتاب ۸ صفر المظفر ۱۳۳۷ھ کو پایہ تکمیل کو پہنچی اس کا ایک ایڈیشن ۱۳۹۴ھ میں مکتبۃ الحبیب سے طبع ہوا۔ اس میں مسلک دیوبند پر بھرپور نقد و تبصرہ کیا گیا ہے اور حق کی حقانیت کو واشگاف کیا گیا ہے او مسلک دیوبند پر بڑے ٹھوس اعتراضات اور مضبوط مواخذے کیے گئے ہیں اس کے اندر کل ۸۰ سوالات و مواخذات ہیں۔ ۳۰ بحث اول میں، ۱۰ بحث دوم میں، ۲۰ بحث سوم میں اور ۲۰ تذلیل ہیں۔ مسئلہ خاتمیت محمدی اور مولوی اسماعیل دہلوی صاحب کی تکفیر فقہی کی بحثیں بھی نہایت تحقیق کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

ادخال السنان:-

یہ بسط البنان کا دوسرا اردو جواب ہے اس کے بارے میں خود مصنف الموت الاحمر

میں رقمطراز ہیں:۔

"اس میں آپ (تھانوی صاحب) سے ایک سو ساٹھ قاہر سوال نہیں، سروپا بیہودہ ایک سو ساٹھ جبال ہیں، چھ سال ہوئے کہ آپ تھانوی صاحب ظاہری (براہ راست خطاب میں تھانوی صاحب بھی لکھا گیا ہے) کے یہاں رجسٹری شدہ گیا ہے اور آج تک بحمد اللہ تعالیٰ لاجواب ہے"۔ ـہ[۵۶]

طرق الہدی والارشاد الی احکام الامارۃ والجہاد۔

یہ رسالہ ۱۳۴۱ھ میں مصنف نے تحریر کیا اس کا خطبہ عربی زبان میں ہے اور طویل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی فصیح و بلیغ ہے عربی ادب کا ذوق رکھنے والا محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ خطبہ کا ایک جملہ یہ ہے "وحرم علی عبادہ موالاۃ سائر الکفرۃ والمشرکین" اسی رسالہ میں اہل کفر و شرک سے محبت و مودت اور اتحاد کی حرمت بتائی گئی ہے اور اہل ایمان کو بڑے جوش و محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور احساس کمتری کے شکار مسلمانوں کو ان کا صحیح مقام و منصب بتایا گیا ہے۔

حاشیہ و شرح الاستمداد علی اجیال الارتداد۔

الاستمداد تین سو ساٹھ اشعار پر مشتمل اردو زبان میں ایک قصیدہ ہے جسے مولانا احمد رضا خاں نے نظم کیا ہے ان اشعار پر حواشی اور ان کی شرح مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے لکھی ہے اس مجموعہ کا تعارف اور شرح کے بارے میں خود شارح الاستمداد تحریر

فرماتے ہیں:-

> " یہ سلیس اردو زبان ہلکی بحر روشن بیان میں تین سو ساٹھ شعر کا ایک مبارک قصیدہ ہے ۳۵ میں نعت والا ہے۔ باقی میں عموماً وہابیہ اور خصوصاً دیوبندیہ کے دو سو تیس اقوال کفر و ضلال کا نمونہ ہے"۔ [۵۷]

طرد الشیطان:-

دوسرے حج کے موقع پر مصنف مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے اس کتاب کی تصنیف کی جس کا دوسرا نام عمدۃ البیان بھی ہے یہ کتاب سعودی حکومت نے حج کے سلسلے میں جو ٹیکس لگائے تھے اس کے رد میں لکھی اور مکہ ہی میں لکھی اس موقع پر بھی مصنف کی بے خوفی کا مظاہرہ دیکھئے سعودی حکومت نے اس سلسلہ میں بہت سختی کر رکھی تھی کہ اس ٹیکس کی جو مخالفت کرے اسے سخت ترین سزا دی جائے مگر انہوں نے اس کی بالکل پرواہ نہ کی اور بے خوف ہو کر کتاب لکھ دی اور سعودی حکومت خاموش رہ گئی۔

شعر و ادب:-

مفتی مصطفیٰ رضا خاں اپنے دور کے باکمال شاعر تھے اور اپنے پیر و مرشد حضرت سید حسین احمد نوری مارہروی کی نسبت سے نوری تخلص کرتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام "سامان بخشش" کے نام سے طبع ہوا جناب نوری نے جس صنف سخن میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے وہ صنف نعت ہے انہوں نے اس خارزار وادی میں خوب طبع

آزمائی کی ہے وہ ایک فطری شاعر تھے ان کا کوئی استاد نہ تھا۔ وہ ایسے ماحول کے تربیت یافتہ تھے جو علم و ادب کا گہوارہ تھا ان کے وطن بریلی کو دیکھئے جہاں بڑے بڑے شاعر و ادیب پیدا ہوتے اور بعض نے دوسری جگہوں سے یہاں آکر بود و باش اختیار کرلی۔ وہ بھی اس شہر (بریلی) کے ادبی ماحول میں ڈھل گئے۔

ان کا مجموعہ کلام "سامان بخشش" ہے جو حمد باری تعالیٰ نعتوں اور درود و سلام وغیرہ کا مجموعہ ہے جسے مکتبہ شرق ۱۱۶ محلہ کانکر ٹولہ، بریلی نے شائع کیا ہے یہ گیارہ انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا اور ۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ سامان بخشش کی نعت و منقبت وغیرہ کے عناوین یہ ہیں۔ ضرب ہو (توحید باری عز اسمہ)، اذکار توحید ذات، اسماء و صفات و بعض عقائد اسلامیہ، مطلع نوری، مہبط انوار، جلوہ جمال یار، عشق کی تلوار، منظور ثنا، جنت کی فضا، فرد غم، مرقد نوری میں چراغاں، سرور خوباں، خورشید درخشاں، ماہِ عرب، ماہ عجم، نقش قدم، در منقبت حضور پر نور سیدنا علاء الملت والدین علی احمد صابر، سلام، رفعت والے عظمت والے، قاسم نعمت۔ سرور عالی مقام۔ غوث اعظم (منقبت)، کھلا میرے دل کی کلی غوث اعظم، تیرا ئل ہے تیرا حرم غوث اعظم، دوسرا ملتا نہیں، موسم بہار، جلوے، داستانِ غم، شراب طہور، مدینے کے خار، نظارا کروں میں، شاہ والا، بہار جانفزا، پیارے گیسو، شانِ خدا تم ہو، شمع رسالت، سید ابرار، داغ دل، اور بستر میں نقشے جما کر چلے، مریض عشق، نگاہِ کرم، شوق دیدار۔

مولانا مصطفیٰ رضا خاں کی شاعری اردو شاعری کی تمام خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے اسی لیے انہیں ایک باکمال شاعر کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر اختر بستوی نے لکھا ہے:-

"مفتی اعظم (مولانا مصطفیٰ رضا خان) ایک باکمال شاعر بھی تھے

> اور وہ بلا شبہ ان شعراء میں شامل تھے جن کے لیے قرآن کا ارشاد ہے "الا الذین آمنو و عملو الصلحت و ذکرو اللہ کثیرا وانتصرو من بعد ما ظلموا" شاعری ایک سحر ہے جو مفتی اعظم ہند جیسے شاعروں کے ہاتھوں میں پہنچ کر سحر حلال بن جاتی ہے۔"[۵۸]

محترم نوری در حقیقت ایک قادر الکلام شاعر تھے ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت، لطافت و دل کشی، سلاست و روانی، نازک خیالی و معنی آفرینی، ندرت تراکیب و استعارات و محاورات کا بر محل استعمال، شوکت الفاظ، سوز و گداز، حقیقت بیانی اور لطیف جذبات و احساسات کی فراوانی و جملہ فنی و شعری خوبیاں پائی جاتی ہیں سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں شرعی سقم نظر نہیں آتا جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

گل ہائے ثنا سے مہکتے ہوئے یار
سقم شرعی سے ہیں منزہ اشعار

نعت گوئی میں فنی محاسن سے زیادہ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر شعر شریعت کی حدود میں رہ کر کہا گیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ اشعار شعری و ادبی اوصاف و محاسن کا مرقع ہو تو یہ شاعر کی قادر الکلامی کا واضح ثبوت ہوتا ہے اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم ان کے مجموعہ کلام نیزا کے اشعار کی تراکیب، زبان و بیان، صنائع و بدائع ردیف و قوافی اور بحروں کا انتخاب "سامان بخشش" کا مطالعہ کرتے ہیں تو جناب نوری اپنے دور کے نعت گو شعراء میں ایک ممتاز مقام پر فائز نظر آتے ہیں، بجا طور پر ان کی کی قادر الکلامی اور ان کے ماہر زبان و فن ہونے کا بھرپور ثبوت فراہم کرتے ہیں

اس قبیل کا صرف ایک شعر بطور نمونہ ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ اس ایک شعر میں صرف لفظ "سرور" چار مرتبہ استعمال کیا گیا ہے لیکن حسن بیان نے لفظ کی تکرار کے باوجود شعر کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آنے دی جب کہ عام طور پر ایک ہی معنی میں کسی لفظ کی تکرار شعر کے حق میں نقص و عیب خیال کیا جاتا ہے وہ شعر ملاحظہ ہو۔

سرور ہے وہی سرور اے سرورِ ہر سرور
ہے آپ کے قدموں پہ سر جسکو فدا کرنا

دنیا کی ساری چیزیں خدا کی تسبیح بیان کرتی ہیں اسی کو شعر کے قالب میں ڈھال کر نوری صاحب لکھتے ہیں۔

سارے عالم کو ہے تیری ہی جستجو
جن و انس و ملک کو تری آرزو

یاد میں تیری ہر ایک ہے ہو بہو
بن میں وحشی لگاتے ہیں ضربات ھُو

اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

نغمہ سنجان گلشن میں چرچا ترا
پپیہے ذکر حق کے ہیں صبح و مسا

اپنی اپنی چہک اپنی اپنی صدا
سب کا مطلب ہے واحد کہ واحد ہے تو

اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

حضرت نوری نے صوفیانہ شاعری بھی کی ہے۔ صوفیوں کے نزدیک خدا کے

علاوہ کوئی موجود نہیں اور دنیا میں ہر جگہ اسی خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اسے انہوں نے اردو کے ساتھ عربی جملے ملا کر اس طرح کہا ہے کہ ؎

لا موجود الا اللہ
لا مشہود الا اللہ
لا مقصود الا اللہ
لا معبود الا اللہ
لا الہ الا اللہ آمنّا برسول اللہ

ہے موجود حقیقی وہ ہے
ہے مشہود حقیقی وہ
ہے مقصود حقیقی وہ
معبود حق حقیقی وہ

لا الہ الا اللہ امنا رسول اللہ

محبوب کے بارے میں شاعروں کے یہاں یہ تصور عام عام طور پر پایا جاتا ہے کہ وہ فتنہ انگیز اور وفا نا آشنا ہوتے ہیں اس کی رفتار میں ایک قیامت پوشیدہ ہوتی ہے وہ جدھر کا رخ کرتا ہے سوئے ہوئے فتنے جاگ اٹھتے ہیں گویا غزل گو شاعروں کی زبان میں محبوب کے حسن و جمال کی کوئی جامع و مانع تعریف ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ محبوب جس سمت بھی اپنے پائے ناز اٹھا دے فتنہ بھی سر اٹھا دے لیکن جب مصطفی رضا نوری نے اپنے محبوب کے حسن و جمال اور خوبی رفتار کی تعریف کی تو اس راز سے پردہ اٹھا کہ حسن رفتار کی صحیح تعریف کیا ہے اور دراصل حسین کہلانے کا مستحق کون

ہے آپ فرماتے ہیں ؎

وہ حسین کیا جو فتنے اٹھا کر چلے
ہاں حسین تم ہو فتنے مٹا کر چلے
فتنے جو اٹھے مٹا ڈالے روش نے آپ کی
کیوں نہ ہو دشمن بھی قائل خوبیٔ رفتار کا

روحِ ایمانی کی تابش کے لیے خشیتِ الٰہی اور حبِ رسول دو لازمی جزو ہیں۔ خدائے برتر کی وحدانیت اور رسالت کا قائل مسلمان تو ہو سکتا ہے مگر ایمان کی معراج تو بندۂ مومن کو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب اس کی نگاہ خدائے برتر کی تجلیوں کی متلاشی ہو، یہیں اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر اور یاد کا امین ہو۔ صاحبِ حال شاعر کی یہ کیفیت اس کے قال میں ملاحظہ ہو ؎

ترا ذکر لب پر، خدا دل کے اندر
یونہی زندگانی گزارا کروں میں

اور پھر یہ تمنا بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

دمِ واپسی تک ترے گیت گاؤں
محمد محمد پکارا کروں میں

اور پھر منزلِ قبر کی دشواریوں کا حل دیکھیں ؎

مرا دین و ایماں، فرشتے جو پوچھیں
تمہاری ہی جانب اشارہ کروں میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت، ان کے اخلاق حسنہ اور رحمت للعالمین کا تو خود قرآن داعی ہے، ان کی عظمت کے معترف تمام انبیاء رہے۔ کتنے نبیوں نے تو ان کی امت میں پیدا ہونے کی تمنا کی تھی وہ حضرت آدم علیہ السلام ہوں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہر ایک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی تھی اور ان کی فضلیت کو تسلیم کیا اور خود خدائے تعالیٰ انہیں وجہ تخلیق کون و مکاں، بنائے زمین و آسماں اور زینت ہر دو جہاں بتاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان عظمتوں کا ذکر شاعر کی زبانی سنئے ؎

تو ہے رحمت، بابِ رحمت تیرا دربان ہوا
سایۂ فضلِ خدا، سایہ تری دیوار کا

جلوہ گاہ خاص کا عالم بتائے کوئی کیا
مہر عالم تاب ہے [illegible] حریم ناز کا

تمہارے جلوہ رنگیں ہی کی ساری بہاریں ہیں
بہاروں سے عیاں تم ہو، بہاروں میں نہاں تم ہو

کوچۂ پر نور کا ہر ذرہ رشک مہر ہے
واہ کیا کہنا ترا، مہر عجم ماہ عرب

تیرے باغ حسن کی رونق کا عالم کیا کہوں
آفتاب اک زرد پتہ ہے ترے گلزار کا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال جس طرح تمام انبیاء کرام میں منفرد و مثالی ہے اسی طرح خدائے وحدہ لاشریک نے انہیں امتیازی صفات سے بھی سرفراز

فرمایا ہے مولانا مصطفیٰ رضا نوری نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے درمیان ایک امتیازی فرق کی جانب انتہائی خوبصورت اشارہ کیا ہے وہ یہ کہ دوسرے تمام انبیاء کرام کو خدائے تعالیٰ نے صفات حق سے نوازا ہے مگر رسول اللہ کی ذات گرامی ذاتِ حق کی مظہر ہے وہ فرماتے ہیں ؎

ہیں صفاتِ حق سے [illegible] آئینے سب [illegible]
ذاتِ حق کا آئینہ [illegible]

[illegible]
آپ سے [illegible]

انبیائے کرام کا ظہور، زمانے کو راہِ راست پر لانے کے لیے قدرت کی طرف سے ہوتا رہا اور انہیں وہ قوتیں بھی ملتی رہیں، جو مافوق الفطرت تھیں۔ جنہیں معجزہ کہا جاتا ہے اور جن کی بدولت وہ زمانے کی نظروں میں برگزیدہ اور برتر ہو سکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضا" حضرت عیسیٰ علیہ السلام" کا دم عیسیٰ" مردوں کا احیاء یعنی مسیحی نفسی اور دیگر انبیاء کے کمالات سب پر ظاہر ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سردار انبیاء تھے اس لیے ان کے معجزات بھی بے شمار اور وہ تمام کمالات جو ہر نبی و رسول کو علیحدہ علیحدہ عطا کیے گئے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں جمع فرما دیے گئے ہیں۔ چاند کا اشارے سے شق ہونا۔ ڈوبے ہوئے سورج کا لوٹنا، ابو جہل کی مٹھیوں میں کنکریوں کی شہادت وغیرہ۔ ان کمالات و معجزات کو اکثر نعت گو شاعروں نے نعت کا موضوع بنایا ہے مولانا نوری کے یہاں بھی اس کے چند نمونے دیکھیے ؎

تمہارے حکم کا باندھا ہوا سورج، پھرے الٹا
جو تم چاہو کہ شب دن ہو، ابھی سرکار ہو جائے

اشارہ پاتے تو ڈوبا ہوا سورج برآمد ہو
اٹھے انگلی تو مہ دو بلکہ دو، دو، چار ہو جائے
تمہارے فیض سے لاٹھی، مثال شمع روشن ہو
جو تم لکڑی کو چاہو تیز تر تلوار ہو جائے

شہرہ لب عیسیٰ کا جس بات میں ہے مولیٰ
تم جان مسیحا ہو، ٹھوکر میں ادا کرنا

نہ سایہ روح کا ہرگز، نہ سایہ نور کا ہرگز
تو سایہ کیسا اس جان جہاں کے جسم اطہر کا

محبت رسول ہی تمام افعال و اعمال اور ایمان کی جان ہے اور اگر کسی کا دل اس سے خالی ہے تو وہ صحیح معنوں میں مومن کامل ہی نہیں۔ نوری اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

جان ایماں ہے محبت تری جان جاناں
جس کے دل میں یہ نہیں خاک مسلماں ہو گا

مصطفیٰ رضا نوری کی نعتیہ شاعری میں ان کی ایک نعت "شمع رسالت" عشقِ رسول کی بیّن ثبوت ہے یہ ان کے ماننے والوں میں کافی مقبول اور مجالس و محافل میں اکثر پڑھی جانے والی نعت رسول ہے اس نعت کے چند شعر ملاحظہ ہوں جو نزاکتِ شعری سے بھرپور ہیں ؎

تو شمع رسالت ہے عالم ترا پروانہ
تو ماہ نبوت ہے اے جلوہ جانانہ

جو ساقیٔ کوثر کے چہرے سے نقاب اٹھے
ہر دل بنے میخانہ ہر آنکھ ہو پیمانہ

تیں شہ نشیں ٹوٹے ہوئے دل کو نہ ہوں کیسے
ہے ٹوٹا ہوا دل ہی مولیٰ ترا کاشانہ

کیوں زلف معنبر سے کوچے نہ مہک اٹھیں
ہے پنجۂ قدرت جب زلفوں کا تری شانہ

اس در کی حضوری ہی عصیاں کی دوا ٹھہری
ہے زہر معاصی کا طیبہ ہی شفا خانہ

ہر پھول میں بو تیری ہر شمع میں ضو تیری
بلبل ہے ترا بلبل پروانہ ہے پروانہ

مولانا مصطفیٰ رضا نوری کی اکثر نعتیہ غزلوں کی زمینیں سادہ اور سہل ہیں مگر کچھ مشکل ردیفوں میں بھی اشعار ملتے ہیں۔ ردیفوں کی سختی کی وجہ سے شعر کی زمین سخت ہو کر رہ گئی ہے مثلاً گیسو والی ردیف اس کے علاوہ "مہر عجم ماہ عرب"، "آنکھوں میں"، "قلم کی صورت" وغیرہ مگر ان زمینوں میں بھی مولانا نوری صاحب کا قلم اپنے مزاج کے اشعار نکال لیتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

حق کے پیارے، نور کی آنکھوں کے تارے ہو تمہیں
نور چشم انبیاء، مہر عجم، ماہِ عرب

کب ہوتے یہ شام و سحر، کب ہوتے یہ شمس و قمر
جلوہ نہ ہوتا گر ترا، مہر عجم، ماہ عرب

آبلے پاؤں میں پڑ جائیں جو چلتے چلتے
راہِ طیبہ میں چلوں، سر سے قدم کی صورت

کھلے ہیں دیدۂ مشتاق قبر میں یوں بھی
ہے انتظار کسی کا ضرور آنکھوں میں

یہ دل تڑپ کے کہیں آنکھوں میں نہ آجائے
کہ پھر رہا ہے، کسی کا مزار آنکھوں میں

ماہِ تاباں پہ ہیں رحمت کی گھٹائیں چھائیں
روئے پرنور پہ یا چھائے تمہارے گیسو

نوری صاحب کے بعض اشعار میں زبان اور انداز بیان اسقدر سادہ ہے کہ نثر کا گمان ہوتا ہے لیکن اہل فن جانتے ہیں سطرح شعرگوئی ایک مشکل ترین عمل ہے مثلاً

خزانے تم کو دے کے، تم کو حق نے
نہ قاسم ہی کہ مالک کر دیا ہے

یہیں سے پاتے ہیں سب اپنے مطلب
ہر اک کے واسطے یہ در کھلا ہے

میں در در کیوں پھروں، دُر دُر سنوں کیوں
مرے سرور مرا کیا سر پھرا ہے

رہے پیش نظر وہ روئے انور
ترستی آنکھوں کی یہ التجا ہے

مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلوی ۱۴ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۸۱ء کو اس دنیائے فانی سے انتقال کر گئے اس وقت ہند و پاک کے تمام اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات نے ان کی تعریفات کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کیا تھا ان میں سے ہم تین زبانوں (اردو، ہندی، انگریزی) کے بعض اخبارات کے تاثرات کو پیش کرتے ہیں جو یہ ہیں۔

انگریزی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا (دہلی) لکھتا ہے، "مولانا مصطفیٰ رضا خان کا انتقال، موصوف کی شخصیت تمام فرقوں کے نزدیک بلسان مقبول تھی۔" انگریزی سے ترجمہ ہفت روزہ نئی دنیا دہلی رقمطراز ہے، "دنیائے اسلام کی ایک مایہ ناز اور جید دینی و علمی شخصیت ہم سے بچھڑ گئی۔" روزنامہ امر اجالا ہندی (بریلی) اپنا تاثر یوں پیش کرتا ہے، "بریلی شریف کے نام سے انہیں سبھی ورگوں سے لوگ سمان دیتے تھے، دیش بہ دیش میں ان کے ایک کروڑ سے ادھک انویائی ہیں۔" [۵۹]

ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے ایک محتاط اندازے کے مطابق دس لاکھ لوگ شریک تھے جو ہند و بیرون ہند کے تھے۔ عالمی حکومتوں کے نمائندے اور سفراء بھی شریک جنازہ تھے۔ صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کا تعزیتی پیغام لے کر سفیر پاکستان حاضر ہوئے اور ہندوستان کے سابق صدر فخرالدین علی احمد کی اہلیہ اہل خانہ کی تعزیت کے لیے حاضر ہوئیں جس سے ان کی عالمگیر شہرت اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے کتنی ہمہ گیر اور مایہ ناز شخصیت تھے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ تذکرۂ علمائے اہل سنت، محمود احمد قادری، کان پور ۱۳۹۱ھ، ص ۴۲، ۴۳

۲۔ کلام رضا، اصغر حسین خان، دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۱۰، ۱۱

۳۔ فاضل بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں، مسعود احمد، الہ آباد فروری ۱۹۸۱ء، ص ۹۳

۴۔ الاجازات المتینہ، حامد رضا خان (قلمی) ص ۳۶

۵۔ دبدبۂ سکندری، رام پور، ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء، ص ۵

۶۔ امام احمد رضا خاں، ایک ہمہ جہت شخصیت، مولانا کوثر نیازی، کراچی جنوری ۱۹۹۱ء، ص ۱۷

۷۔ Neglected Genius of the East by Pro
Muhammad Masud Ahmed, Karachi Page 11

۸۔ Imam Ahmed Raza has left A Rich Treasure
of knowledge by, Karachi Page 18

۹۔ ضمیمہ المعتقد المنتقد، اعجاز ولی خان، لاہور، ص ۲۶۶

۱۰۔ لمعۃ الایمان اہل حدیث کی نظر میں، ناشر رضا اکادمی بمبئی ص ۵، ۶

۱۱۔ حصہ تقریظات الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ، مولانا احمد رضا خان، کراچی ص ۲۷۰

۱۲۔ نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، الجزء الثامن، ابوالحسن ندوی، حیدر آباد ۱۹۷۰ء، ص ۴۱

۱۳۔ چودہویں صدی کے مجدد اعظم، مولانا ظفر الدین بہاری مشمولہ مضمون حیات مبارکہ از پروفیسر
مسعود احمد، ص ۲۱

۱۴۔ امام اہل سنت! ڈاکٹر مسعود احمد، الہ آباد ۱۹۸۱ء، ص ۴۲

۱۵۔ تاریخ نعت گوئی میں حضرت رضا بریلوی کا منصب، شاعر لکھنوی، لاہور، ص ۲۴، ۲۵

۱۶۔ امام احمد رضا خان ایک ہمہ جہت شخصیت، کوثر نیازی، ص ۲۳، ۲۴

۱۷۔ اردو میں صوفیانہ شاعری، ڈاکٹر محمد طیب ابدالی، الہ آباد مئی ۱۹۸۴ء، ص ۱۴۳

۱۸۔ عرفان۔ سنا، ڈاکٹر الٰہی بخش، الہ آباد ۱۹۸۲ء۔ ص، ۴۷

۱۹۔ محمود احمد قادری نے تذکرہ علمائے اہل سنت مطبوعہ کانپور ۱۳۹۱ھ ص ۸۷ میں یہ لکھا ہے کہ حسن ۴ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے جو ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کی تحریر کے مطابق درست نہیں ہے انہوں نے "چند شعراء بریلی" میں ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء سنہ پیدائش و تاریخ لکھا ہے جو میرے نزدیک درست ہے کیوں کہ ادیب صاحب حسن کو بہت قریب سے جانتے ہیں وہ خود بریلی کے رہنے والے ہیں۔

۲۰۔ اداریہ، اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، حسرت موہانی، جون ۱۹۱۲ء

۲۱۔ تفسیر ابر کرم، مولوی امیر الدین، دہلی ۱۳۰۷ھ، ص ۸۹

۲۲۔ مکتوب شیخ شمس الدین میر محی بنام ڈاکٹر ایوب قادری مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۵۹ء۔

۲۳۔ انوار ساطعہ، عبدالسمیع بیدل، مطبع نعیمی مراد آباد ص ۲

۲۴۔ اردوئے معلیٰ، شمارہ اول، جلد اول (غالب نمبر)، دلی، فروری ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۱

۲۵۔ تلامذہ: مالک رام، نئی دلی ۱۹۸۴ء، ص ۸۷

۲۶۔ خانقاہ رشیدیہ جون پور (یو۔پی) کی بنیاد آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال سے زائد پہلے بادشاہ شاہ جہاں کے زمانہ میں حضرت محمد رشید صاحب (دیوان جی) کے ہاتھوں پڑی (تجلیات آسی، ڈی، این خزدیدی ص ۴۸)

۲۷۔ عین المعارف، نقد و نظر: مجنوں گورکھپوری، مطبوعہ پاکستان، کراچی اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۳۸

۲۸۔ عین المعارف، مطبوعہ کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۷۵، ۷۶ (ملحق مضمون از شاہد علی علیمی)

۲۹۔ قومی ڈائجسٹ، لاہور اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۱

۳۰۔ تجلیات آسی: ڈی این چترویدی ص ۶۰

۳۱۔ نوائے وقت، لاہور ۲۴ اپریل ۱۹۷۵ء

۳۲۔ نقوش لاہور نمبر ص ۹۳۹

نوٹ:۔ سید محمد سرتاج حسین رضوی، روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی سے مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ انھوں نے نہایت ہی نفیس تحقیقی مقالہ قلم بند ہے جو یونیورسٹی میں ۱۹۹۷ء میں داخل کر دیا ہے۔ یہ قابل مطالعہ ہے۔ ناشر

۳۳۔ المیزان (ماہنامہ) بمبئی ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء۔
۳۴۔ المیزان، بمبئی اپریل ۱۹۴۶ء۔
۳۵۔ ماہنامہ حجاز جدید، دہلی، جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۵۰
۳۶۔ تذکرہ علمائے اہل سنت، محمود احمد قادری، مطبوعہ کان پور ۱۳۹۱ھ ص، ۵۳
۳۷۔ شذرات، سید سلیمان ندوی، معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۳۹ء، ص ۴۰۲
۳۸۔ تذکرہ علمائے اہل سنت: محمود احمد قادری، کان پور ۱۳۹۱ھ ص ۱۰۱
۳۹۔ گنجہائے گرانمایہ، رشید احمد صدیقی، فرینڈز پبلشرز راولپنڈی ۱۹۵۱ء، ص ۵۵
۴۰۔ فکر و نظر، ناموران علی گڑھ تیسرا کارواں (جلد دوم) خصوصی شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۵۱
۴۱۔ کاروان حیات، مشتاق احمد خاں، لاہور ۱۹۷۴ء، ص ۸۸
۴۲۔ نیا دور، ابوالکلام آزاد نمبر ص ۴۵۔۴۶ مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد کا تحریک خلافت میں حصہ" از محمد رضا
۴۳۔ النور، سلیمان اشرف ص ۲۰۱
۴۴۔ فکر و نظر، ناموران علی گڑھ تیسرا کارواں، جلد دوم، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۴۶
۴۵۔ النور، سلیمان اشرف ص ۲۳۱
۴۶۔ النور، سلیمان اشرف مطبوعہ علی گڑھ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء، ص ۱۴۷۔۱۴۹
۴۷۔ النور، سلیمان اشرف ص ۲۰۲
۴۸۔ تذکرہ علمائے اہل سنت، محمود احمد قادری، ص ۱۰۰
۴۹۔ الحج، سلیمان اشرف، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۸ء۔

۵۰۔ تذکرہ علمائے اہل سنت، محمود احمد قادری ص ۱۰۰

۵۱۔ گنجہائے گرانمایہ، رشید احمد صدیقی، فرینڈز پبلشرز راولپنڈی 1951ء ص ۳۵۔۳۶

۵۲۔ ماہنامہ اعلیٰ حضرت، بریلی، جولائی ۱۹۶۵ء ص ۱۰

۵۳۔ ماہنامہ مجاز جدید، دلی، ستمبر اکتوبر ۱۹۹۰ء ص ۷۷

۵۴۔ ماہنامہ استقامت (کانپور، ماہ مئی ۱۹۸۳ء) ص ۱۵۲

۵۵۔ ماہنامہ مجاز جدید، دلی ستمبر اکتوبر ۱۹۹۰ء ص ۸۰

۵۶۔ الموت الاحمر، مصطفیٰ رضا، مکتبۃ الحبیب الہ آباد ص ۲۱۰

۵۷۔ مقدمہ الاستمداد، ص ۳۲

۵۸۔ ماہنامہ استقامت کانپور، مئی ۱۹۸۳ء ص ۲۹۸

۵۹۔ یہ سارے اخباری تاثرات ماہنامہ استقامت (ڈائجسٹ)، کانپور، ماہ مئی ۱۹۸۳ء کے حوالے سے درج ہیں۔

مقالہ پی۔ایچ۔ڈی

کنزالایمان
اور
معروف تراجمِ قرآن

ڈاکٹر مجید اللہ قادری

(ایم۔ایس۔سی، ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی)

(رجسٹرڈ)
ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا۔پاکستان
کراچی ــــــ اسلام آباد